راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 16 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

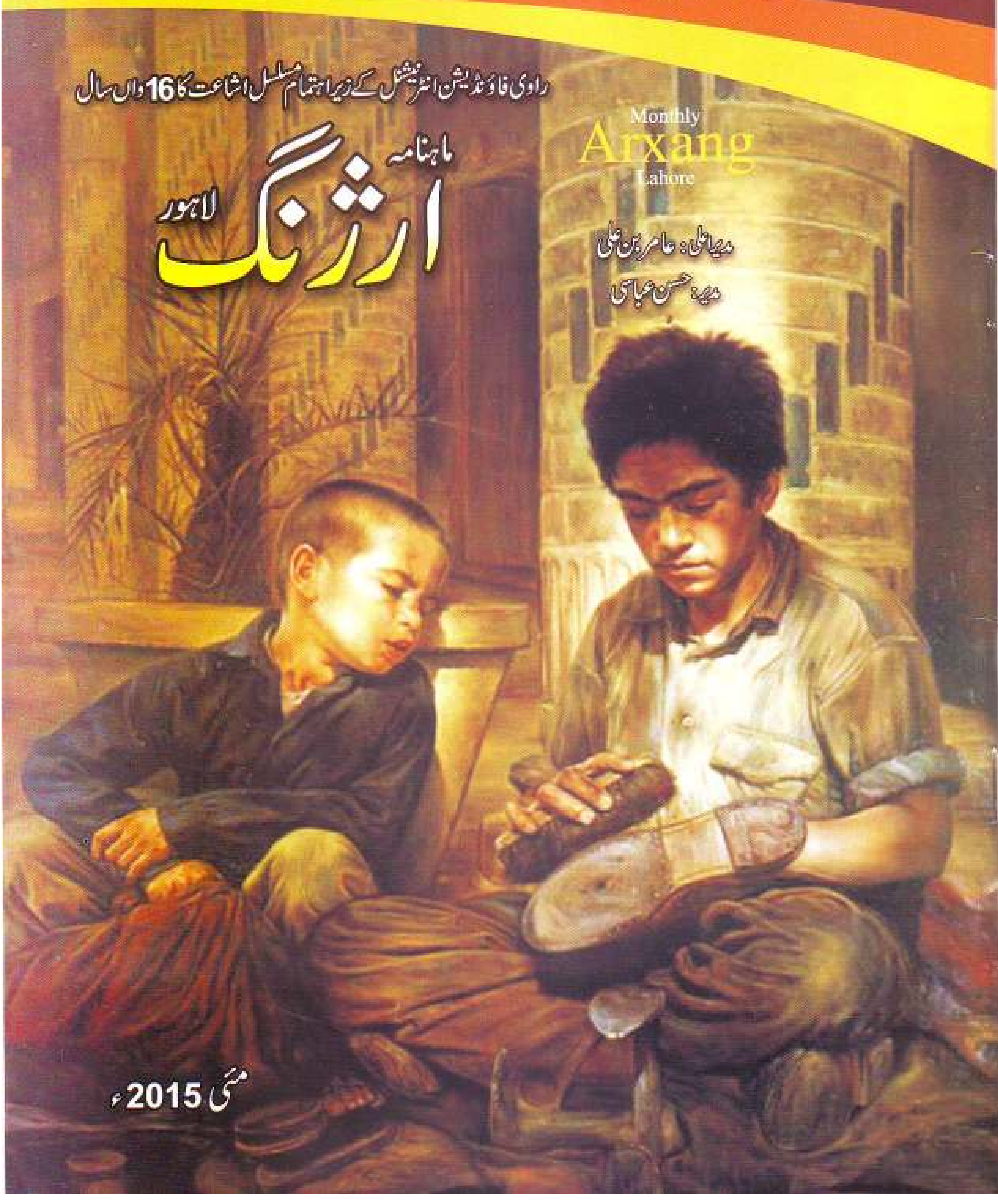

مئی 2015ء

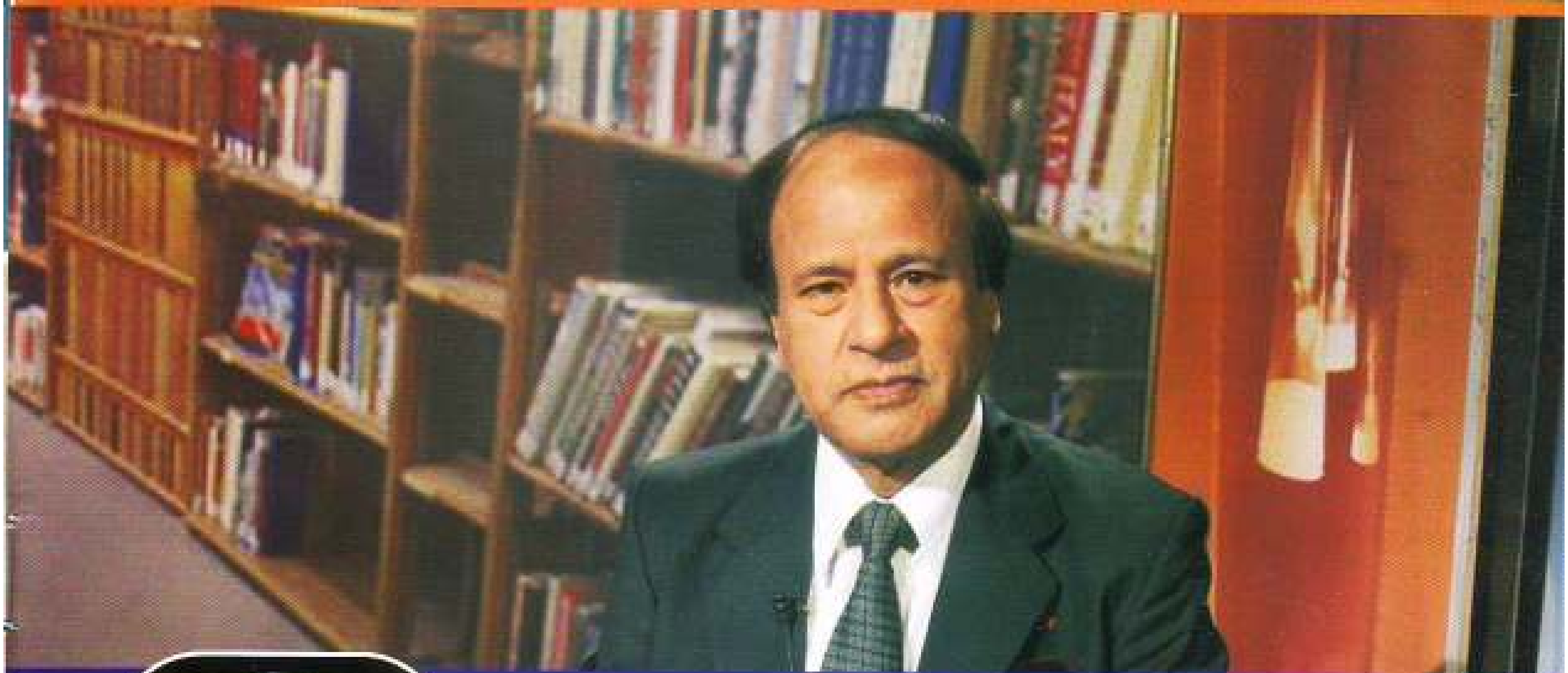

میں نہیں سمجھتا کہ شاعری میں خاص طور پر اُستادی شاگردی ہو سکتی ہے

ہمیں بے شمار نادان دوستوں کی نسبت محض گنتی کے مخلص ساتھیوں کی ضرورت ہے

ممتاز شاعر، کالم نگار، کمپیئر اور دانش ور اعزاز احمد آذر سے عامر بن علی کی گفتگو

ارژنگ: شعروادب کی طرف کیسے آنا ہوا؟

اعزاز احمد آذر: پتہ نہیں۔ قدرت نے یہ کوئی سزا دے کے ہی بھیجا تھا۔ مجھ پر اس بات کا انکشاف اس وقت ہوا جب میں عرف عام میں شاعر بن چکا تھا۔

ارژنگ: شاعر "بن چکے" سے آپ کی کیا مراد ہے؟

اعزاز احمد آذر: شعر کہنے کی جو صلاحیت ہے اس سے میری مراد یہ ہے کہ شعر تو میں کافی عرصہ سے کہتا چلا آ رہا تھا طبیعت ابتدا سے ہی موزوں تھی اور اسی دوران میں شاعری کی باریکیاں کافی حد تک سیکھ چکا تھا۔ جس کا احساس میرے شعر پڑھ کر لوگوں نے مجھے دلایا۔

ارژنگ: شاعری کی طرف خاص طور پر کیسے راغب ہوئے؟

اعزاز احمد آذر: یہ رجحان تو فطری طور پر تھا۔ ہمارے ایک سینئر دانشور مرحوم مشتاق بٹ کہا کرتے تھے کہ دنیا میں دو قومیں ایسی ہیں جن میں کوئی بھی ماں جب کسی بچے کو جنم دیتی ہے تو وہ شاعر ہی کو جنم دیتی ہے۔ ایک عرب ماں اور دوسری پنجابی ماں۔ اب یہ بعد کی بات ہے کہ کوئی اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار لاتا ہے یا اس کی پرورش کرتا ہے لیکن پیدائشی طور پر اس میں رجحان موجود ہوتا ہے اور اب میں ایک طویل تجربے اور مشاہدے کے بعد ان کے اس نظریے کی تائید کرتا ہوں۔ رجحان تو ظاہر ہے یہ فطری تھا۔ اب رہی بات کہ کسی شاعر سے متاثر ہونے کا سوال تو میں ابتداء سے ہی شاعروں سے کم متاثر ہوا ہوں۔ میں جب متاثر ہوا شعر سے متاثر ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے

> شاعر اور ادیب کا معاشرے میں وہی کردار ہوتا ہے جو قدرت نے تفویض کر کے اُسے بھیجا ہے

اپنے سینئر اور اپنے ہم عصر شعراء کو ان کے کلام کو خاصا توجہ سے سنا اور پڑھا ہے۔ ان کے ساتھ نشست و برخاست کا جب سے موقع ملنا شروع ہوا ہے ان لمحات سے بھی پورا استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ سو عین ممکن ہے کہ ان سب چیزوں نے مل کر میری فنی اور فکری تربیت میں اپنا رول ادا کیا ہو۔

ارژنگ: گویا آپ نے باقاعدہ کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی؟

اعزاز احمد آذر: جی بالکل نہیں کی اور میں نہیں سمجھتا کہ شاعری میں خاص طور پر اُستادی شاگردی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ میرے نزدیک شاعر ہونے کی شرط اوّل خیال اور فکر کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے اور خیال تو قدرت کی عطا ہے۔ شاعری کا دوسرا حصہ کرافٹنگ ہے۔ شعر کی بنت کاری کہہ لیں اسے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جو کسی بھی عمر میں کہیں سے بھی سیکھا جا سکتا ہے اور اس کے لیے شاعر ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ جیسا کہ ہمارے نقاد حضرات ہوتے ہیں۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 16 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر ۱۷ • مئی ۲۰۱۵ء • شمارہ نمبر ۵

مدیر اعلیٰ ⊙ عامر بن علی

مدیر ⊙ حسن عباسی

مدیران اعزازی ⊙ ڈاکٹر صغرا صدف ⊙ ابرار ندیم ⊙ تن دیپ تمنا

نائب مدیران ⊙ قمر ریاض ⊙ خالد سجاد

مدیران معاون ⊙ نازو کاڑوی ⊙ بدر سیماب

مدیر نظم ⊙ علی رضا

مجلس مشاورت ⊙ احسان شاہد (جاپان) ⊙ ظفرا سلام (آسٹریلیا) ⊙ سعدیہ سیٹھی (جاپان)

قانونی مشیر ⊙ کامران ناشط : 0300-8800339 سرکولیشن ⊙ شاہد عباسی

ارژنگ دوست ⊙ انیلہ ظفر (امریکہ) ⊙ ارشد شاہین (امریکہ) ⊙ اسعد نقوی (فرانس) ⊙ ارشد نذیر ساحل (عمان)

کمپوزنگ ⊙ رباب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹوگرافر ⊙ نعمان حسن : 0333-4918383

آسٹ اینڈ گرافکس ⊙ محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 نازو کاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

اندرون ملک (پاکستان) 1000 روپے • ڈاک خرچ بیرون ملک 5000 روپے

رابطہ : 0300-4489310 - 0331-4489310

فہرست

حمد: ۲

نعت: ۳

مضامین:

- جٹ کالم نگار بھی ہو سکتے ہیں؟ / عطاء الحق قاسمی ' ۴
- بری شاعری سے کیا مراد ہے؟ / ہرمن ہیسے / کشور ناہید ' ۶
- پابلو نرودا اور گبریلا مسترال... تعارف و شاعری / عامر بن علی ' ۸
- جناب ظفر اقبال سے معذرت کے ساتھ / حسن عباسی ' ۱۴
- فکرِ جہانِ دگر / نازو کاڑوی ' ۱۶

طنز و مزاح:

- ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں / حسین احمد شیرازی ' ۱۷
- پیرس او ئے پیرس / احمد سعید ' ۲۱

افسانے:

- باپ / کیتھرین لم / عطا صدیقی ' ۲۳
- مٹھی بھر کھجوریں / طیب صالح (سوڈان) / احمد صغیر صدیقی ' ۲۶
- طوطا / موپساں (فرانس) / ستار طاہر ' ۲۹

عالمی ادبی شعری تراجم: ۳۲ تا ۳۳

- طوطا / موپساں (فرانس) / ستار طاہر ' ۲۹

شعری گوشہ: غلام حسین ساجد ' ۳۹

متفرق شاعری ' ۴۰ تا ۴۳

تبصرہ کتب ' ۴۴

- ادبی خبریں ' ۴۸ تا ۵۰
- نامہ ہائے احباب ' ۵۱

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد

رابعہ لودھی نہاں

پھیلا ہے دو جہاں میں اس نور کا اُجالا
جپتی ہے ساری دنیا اس نام ہی کی مالا
تیرا ہی در مقدس جھکتے ہیں سب اسی پر
ہم سب کا تو ہے والی ہم سب کا تو ہے مولا
تیرے ہی آگے ہم سب پھیلا رہے ہیں دامن
ہم کیوں کسی سے مانگیں جب تو ہے دینے والا
تیری ہی شان ارفع تیرا ہی ذکر اطہر
دنیا ہے ساری ادنیٰ تیری ہی ذات اعلیٰ
قائم ہے ساری دنیا تیرے ہی آسرے پر
تُو ہی ہے سب کا رازق تو نے ہی سب کو پالا
تُو ہے ازل سے قائم تو ہی رہے گا دائم
دونوں جہاں میں مولا تیرا ہی بول بالا

تیری سرکار سے اونچی کوئی سرکار نہیں
تیرے دربار سے اعلیٰ کوئی دربار نہیں
تیرے در کے ہیں گدا خالی نہیں جائیں گے
بھیک تجز تیرے کسی سے ہمیں درکار نہیں
نعمت انسان کو دی عقل و خرد، نطق و زباں
تیرے شہکار سے اچھا کوئی شہکار نہیں
علم کے بحر کو قرآن میں سمویا تو نے
تیرے اخبار سے اچھا کوئی اخبار نہیں
جان بھی دے دوں محمدؐ پہ نہ جائے حسرت
تیرے دلدار سے پیارا کوئی دلدار نہیں
یہ عقیدہ ہے نہاںؔ کا تو ہے شاہِ دو جہاں
تجھ سا کوئی بھی یہاں مالک و مختار نہیں

اے مالکِ روح و قلم ایسی کوئی تحریر
کعبہ ہو مقدر تو مدینہ بنے تقدیر
دل میں بسا کعبہ تو ہے آنکھوں میں مدینہ
رہتی ہے تصور میں ہمیشہ یہی تصویر
بڑھتی ہوں جو اک گام پلٹ جاتی ہوں دو گام
ڈالی ہے مقدر نے میرے پاؤں میں زنجیر
میں تیری بھکارن ہوں تو کاسہ میرا بھر دے
ڈال اس میں رضا اپنی تو دے قلب میں تنویر
مانگا ہے جو کچھ میں نے وہی تو نے دیا ہے
لوٹی نہیں ہوں در سے ترے میں کبھی دلگیر
چمکے گا مقدر مرا یہ آس ہے مجھ کو
بنتی ہے ترے حکم سے بگڑی ہوئی تقدیر
ہر کام وہی ہوگا جو منظور تجھے ہے
تقدیر کے آگے کبھی چلتی نہیں تدبیر
اب در پہ بلا لے مجھے روضہ بھی دکھا دے
مولا تو جگا دے مری سوئی ہوئی تقدیر

تری حمد ہر وقت وردِ زباں ہے
مکاں کا ہے مالک مگر لامکاں ہے
ثنا کے بعد لائق تری ذات اکبر
زمانے پہ تیرا کرم بے کراں ہے
ترے سامنے سب کے پھیلے ہیں دامن
تری رحمتوں کا تو دریا رواں ہے
جو ذی روح ہے تیرے در کا ہے منگتا
ترے دم سے قائم زمیں آسماں ہے
کہیں گھوم لے تیرا بندہ جہاں میں
مگر تیرے در پر ہی ملتی اماں ہے
تیری ذات اعلیٰ و ارفع ہے سب سے
تو معبود و مسجود ہر دو جہاں ہے

جب بھی دشمن مری مشکل کو بڑھا دیتا ہے
میرا مالک مجھے دریا سا بنا دیتا ہے
میرے اپنوں سے مجھے روز ملا دیتا ہے
وہ تو جیون بھی مجھے روز نیا دیتا ہے
وہ تو انسان کو بے عیب بنا دیتا ہے
اپنا معیار گنہ گار گرا دیتا ہے
پھول بن مالی بھی صحرا میں کھلا دیتا ہے
وہ ہی ذی شان ہے قادر ہے بتا دیتا ہے
تیشۂ شوق کی شدت بھی واثق ہو تو
وہ زلیخا کو بھی یوسف سے ملا دیتا ہے
میرا مالک تو وہ رازق ہے کہ جو خلقت کو
سینۂ سنگ میں بھرپور غذا دیتا ہے
ایسا رحمان کہ احساسِ ندامت پر بھی
میری کتنی ہی خطاؤں کو مٹا دیتا ہے
ایسا محسن کہ مرے عیب عیاں کرتا نہیں
اور سجدے مرے ماتھے پہ سجا دیتا ہے

زاہد شمس

نعت/خالد نقاش، لاہور

موج بلا میں اُنؐ کی مدد کو جو دی صدا
دریا سمٹ کے سارا کنارے میں آ گیا

ہر شاخ جلی حسرت و اُمید و طلب کی
اُتری ہے گلستاں میں وہ دھوپ غضب کی
قیمت ہے کوئی سر کی نہ دستار کی حرمت
یوں خوار و زبوں اُمتِ سرکارؐ ہے کب کی
اغیار کے ہاتھوں میں کھلونا بنی اُمت
اک چشمِ کرم چاہتی ہے شاہِؐ عرب کی
مٹی میں ہوئی مٹی مسلمان کی آقاؐ
وہ دھاک جو ہوتی تھی کبھی نام و نسب کی
نقاش یہی اپنا عقیدہ ہے سدا سے
اُمت ہیں محمدؐ کی تو مخلوق ہیں رب کی

اُنؐ کے کرم سے ایسے نظارے میں آ گیا
گردوں سمٹ کے میرے ستارے میں آ گیا
کملی کی چھاؤں ابرِ کرم مجھ پہ بن گئی
میں دوپہر کے جب بھی خسارے میں آ گیا
جب سے ہوا ہوں اُنؐ کے اشارے پہ گامزن
نظمِ جہان میرے اشارے میں آ گیا
موج بلا میں اُنؐ کی مدد کو جو دی صدا
دریا سمٹ کے سارا کنارے میں آ گیا
رستے کی سب رکاوٹیں خود دور ہو گئیں
دامانِ شہؐ کے جب سے سہارے میں آ گیا
نقاش اُنؐ کی سیرتِ اطہر کے نور سے
سورج اُبھر کے شب کے نظارے میں آ گیا

جو شے دعا میں مانگی، اُسی شے کو پا لیا
ذاتِ نبیؐ کو جب سے وسیلہ بنا لیا
دامانِ مصطفیٰؐ کو زمانے میں تھام کر
ہم نے عذابِ حشر سے دامن چھڑا لیا
اسرارِ کائنات نظر پر کھلے سبھی
طیبہ کی خاک آنکھ کا سرمہ بنا لیا
ذاتِ نبیؐ کو کر کے سرِ راہ رہ نما
ذاتِ خدا کا ہم نے ہر اک بھید پا لیا
مل کر بدن پہ شہرِ محمدؐ کی خاک کو
دوزخ کی سخت آگ سے خود کو بچا لیا
نقاش ہم نے وار کے ساری محبتیں
حبِ رسولِؐ پاک کو دل میں بچا لیا

نعت سے کام چل گیا کیا کیا
غم کا موسم بدل گیا کیا کیا
اُنؐ کے لطفِ کریم پر گھر سے
جادو ٹونہ نکل گیا کیا کیا
کیسے کیسے طلوع چاند ہوئے
سایۂ درد ڈھل گیا کیا کیا
یادِ شاہِؐ اُمم کے صدقے میں
سر سے طوفان ٹل گیا کیا کیا
رُوئے احمدؐ کی اک تجلی سے
دیپ ظلمت میں جل گیا کیا کیا
درِ سید کو دیکھ کر نقاش
دل سے جذبہ اُبل گیا کیا کیا

کم ہیں تمام مرتبے خیر الانامؐ سے
عظمت کھلی ہے اُنؐ کی خدا کے کلام سے
کردارِ مصطفیٰؐ ہے وہ کردارِ معتبر
ٹکرا گیا جو ظلم و ستم کے نظام سے
ذہنِ بشر پہ کھلتے گئے آگہی کے در
عقلیں سنور گئی ہیں نبیؐ کے پیام سے
میں بھیجتا ہوں اُن پہ سلامی درود کی
مہکا ہوا ہے وقت درود و سلام سے
روئے نبیؐ کی ایک تجلی کے فیض سے
آزاد ہو گیا ہوں میں ظلمت کے دام سے
نقاش اُس کے نام پہ رکھے جہاں نے نام
جس نے نبیؐ کا نام لیا احترام سے

ہے دھوپ میں اک سایا دربار محمدؐ کا
برگد کی طرح پایا دربار محمدؐ کا
آتے ہیں یہاں قدسی دربان کی صورت میں
جنت سے سوا پایا دربار محمدؐ کا
رحمت ہے یہ دنیا میں، دنیا میں یہ رحمت ہے
اللہ نے فرمایا دربار محمدؐ کا
جو لے کے طلب جائے خواہش سے سوا پائے
دیتا ہے بدل کایا دربار محمدؐ کا
یہ عقدہ کھلا مجھ پر دربار محمدؐ میں
کعبے کی طرح پایا دربار محمدؐ کا
نقاش یہ اپنے کیا، نقاش پرائے کیا
ہر شخص کو ہے بھایا دربار محمدؐ کا

جٹ کالم نگار بھی ہو سکتے ہیں؟

عطاء الحق قاسمی

ایک شیخ صاحب نے پان والے کو پانچ روپے کا سکہ دیا اور کہا ''پان میں الائچی اور سونف زیادہ ڈالنا، میٹھی چھالیہ اور اشرفی تو تم ڈال ہی دو گے، گل قند اور کھوپرا بھی ڈال دینا، اور ہاں زعفران تو ضرور ڈالنا'' پان والے نے یہ سنا تو کہا ''شیخ صاحب! آپ نے پانچ روپے کا جو سکہ دیا ہے، پان میں وہ بھی نہ ڈال دوں؟'' یہ لطیفہ مجھے ہر اس ''ابتلا'' کے موقع پر یاد آتا ہے جب مجھے کسی کتاب پر اظہار خیال کرنا ہوتا ہے۔ مصنف کی خواہش ہوتی ہے کہ مضمون میں وہ سب کچھ ڈال دیا جائے جس کی فرمائش شیخ صاحب نے کی تھی۔ جبکہ کتاب کی ''حیثیت'' بھی شیخ صاحب کے سکے کے برابر ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا رہتا ہوں کہ یا باری تعالیٰ جب کوئی نئی کتاب شائع ہو تو مصنف کی ''میموری'' (Memory) میں سے میرا نام ''ڈیلیٹ'' کر دینا۔ دراصل میرے سمیت کوئی بھی سچ سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کسی نے پوچھا تھا کہ مرچیں کس موسم میں زیادہ لگتی ہیں۔ جواب ملا اس کا کوئی خاص موسم نہیں ہوتا، جب بھی سچ بولو لگنے لگتی ہیں۔''

سو اس صورت حال میں جب صغریٰ صدف کے کالموں کی کتاب ''نقطہ'' شائع ہوئی تو آپ یہ سن کر حیران ہرگز نہ ہوں کہ مجھ پر لرزہ بالکل طاری نہ ہوا۔ کیونکہ اس کے یہ کالم کتابی صورت میں آنے سے پہلے میں اخبار میں پڑھ چکا تھا۔ ان دنوں پاکستان کی آدھی آبادی ''کالم نگار'' ہے اور باقی آدھی ''کالم نگار'' بننا چاہتی ہے۔ چنانچہ رطب و یابس کے اس وسیع ''ذخائر'' میں سے آپ کی نظر اگر کسی ایسے کالم پر پڑتی ہے جو پڑھنے کے قابل ہوتا ہے تو کم از کم میں اس پر سجدہ شکر ضرور ادا کرتا ہوں۔ صغریٰ نے جب کالم نگاری شروع کی تو مجھے اس کا اندازہ پہلے ہی ہو گیا تھا کہ وہ یہ بھاری پتھر اُٹھا لے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں صغریٰ کو جانتا ہوں، اس کے اندر غم اور خوشی کی کئی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ وہ ہر طرح کے حالات میں دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے کم از کم بارہ گھنٹے بھانت بھانت کے لوگوں کے درمیان رہتی ہے۔ اس کا اپنا سیاسی نظریہ بھی یقیناً کوئی نہ کوئی ہوگا۔ مگر اس کے مراسم سیاسی جماعتوں کے سرکردہ افراد سے بھی ہیں۔ ادیب تو اس کی برادری کے ہیں۔ چنانچہ اس کا زیادہ وقت انہی کے ساتھ بسر ہوتا ہے۔ تو جو انسان اپنے گھر کے بند کمرے میں بیٹھ کر کالم لکھتا ہو اور اس نے کمرے کی کھڑکیاں بھی کھلی نہ رکھی ہوں، وہ کیا لکھے گا۔ کالم نگاری معاشرے کے تمام طبقوں میں جھانکنے کا نام ہے اور صغریٰ صدف کالم نگاری کا ہنر اس لیے بھی جانتی ہے کہ اس نے اپنے کمرے اور اپنے دل و دماغ کی کھڑکیاں بھی کھلی رکھی ہوئی ہیں!

اس ضمن میں ایک اور بات بہت اہم ہے۔ کالم میں صرف مشاہدہ نہیں، مطالعہ بھی اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ صغریٰ صدف نے ایم اے فلاسفی کیا ہوا ہے اور اس مضمون میں وہ چھولے دے کر پاس نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ فلسفے کے ایک عام سے طالب علم سے زیادہ اس مضمون سے دلچسپی رکھتی تھی۔ چنانچہ اس کی بہت سی دوسری تحریروں کے علاوہ اس کے کالموں میں بھی یہ جھلک نظر آتی ہے۔ صغریٰ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے اور میں اسے کالم نگاری کی بنیادی شرط سمجھتا ہوں کہ آپ کو ثقیل سے ثقیل بات بھی ہلکے پھلکے پیرائے میں کرنا ہوتی ہے۔ آپ کا کالم ''ریڈایبل'' (Readable) ہونا چاہیے۔ ورنہ یہ کالم نہیں جواب مضمون ہے۔ صغریٰ صدف اس نزاکت سے واقف ہے۔ چنانچہ وہ اپنے قاری پر اگر کبھی ''علمی تشدد'' بھی کرتی ہے تو اس کی چیخیں نہیں نکلتیں، وہ صرف ایک ''ہائے'' پر اکتفا کر کے رہ جاتا ہے۔

ابھی میں نے نزاکت کی بات کی تھی، تو جو لوگ صغریٰ صدف سے نہیں ملے ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ نازک اندام نہیں بلکہ گجرات کی جٹی ذات پات کے حوالے ہی سے نہیں بلکہ اپنی دراز قامتی اور تیکھے خدوخال سے بھی جٹی ہی لگتی ہے۔ تاہم وہ ان جٹوں میں سے نہیں ہے جن میں سے ایک جٹ میرے ایک دوست کی معرفت میرے پاس آیا تھا، اس کے ساتھ خوفناک مونچھوں والا ایک نوجوان بھی تھا۔ اس نے اس مشکوک شکل و

صورت والے نوجوان کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ اس کا بیٹا ہے۔ انتہائی نیک اور پرہیزگار اور پھر فرمایا ''قاسمی صاحب پولیس اس معصوم کو بلاوجہ تنگ کر رہی ہے۔ آپ آئی جی کو فون کر کے ان پولیس والوں کی پیٹیاں تو اُتروائیں۔'' میں نے پوچھا ''ماجرا کیا ہے؟'' بولا ''ماجرا کیا ہونا ہے جی ''جنا'' آدمی ہے، اس نے گاؤں کے تین چار بندوں کی گردنیں ''لاہ'' دی تھیں۔ اب پولیس اس کی گرفتاری کے لیے گھر پر چھاپے مار رہی ہے۔ گھر میں پردہ دار بیبیاں ہیں۔ پولیس کو اس کی بھی پروا نہیں۔ بس آپ آئی جی کو فون کر کے ان کی پیٹیاں تو اُتروائیں'' تاہم جیسا کہ میں نے پہلے کہا صغریٰ صدف ایسی جنی نہیں، وہ جینے ہنسانے اور ہر بات پر ''جیندے وسدے رہو'' کہنے والی خاتون ہے۔ اس کے کالموں کی ''ضربِ عضب'' سے تو وہ بھی محفوظ ہیں جو محفوظ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ اس ''ضرب'' جو اس کے صحیح ''حقدار'' ہیں، اصل بات یہ ہے کہ وہ اپنے سیاسی نظریات میں اُجڈ (Rigid) نہیں ہے۔ وہ صلح کل ہے یعنی یہ بھی صحیح ہے۔ وہ بھی صحیح ہے، مجھے حیرت ہے کہ اس نے اپنے اس مزاج کے تشکر کے اظہار کے طور پر ابھی تک گولڈن ٹمپل امرتسر جا کر ''متھا'' کیوں نہیں ٹیکا؟

ایک بات اور...... کالم نگاری دریا کو کوزے میں بند کرنا ہے۔ چنانچہ اس کی طوالت کی بھی ایک حد مقرر ہے۔ کالم اس حد سے نہ کم ہو اور نہ زیادہ! صغریٰ صدف اس نقطے سے واقف ہے ورنہ ایک صاحب بال کٹوا کر آئے تو دوست نے کہا کہ تم نے بال اتنے چھوٹے کیوں کروائے؟ اس نے جواب دیا ''حجام کے پاس چینج نہیں تھا، میں نے اسے کہا بیس روپے کے اور کاٹ دو'' صغریٰ کالم میں ''چینج'' چھوڑنا گوارا کر لیتی ہے مگر ایسا نہیں کرتی۔ باقی رہے کالم کے مندرجات تو میرے نزدیک وہ روشن خیال، رواداری، امن، عوام کی خوشحالی اور ریاست پاکستان کو مستحکم دیکھنے کی خواہش مند کالم نگار ہے اور میرے خیال میں یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم میں سے کچھ اور لوگ بھی یہ کام کرتے ہیں لیکن وہ اس کے علاوہ بھی ''بہت سے کام'' کرتے ہیں کہ وہ

ع بیکار باش، کچھ کیا کر

کے قائل ہیں۔ صغریٰ چونکہ بیکار بیٹھنا جانتی ہی نہیں۔ لہٰذا اسے فالتو کام کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ صغریٰ کے کالم مختلف موضوعات پر ہمیں سوچ بچار کی دعوت دیتے ہیں اور یہ بھی بہت ضروری ہے۔ کیونکہ ہم من حیث القوم دولے شاہ کے چوہے بنتے جا رہے ہیں۔ ایک شخص نے ایک باباجی سے پوچھا ''باباجی ایسی بیوی کو کیا کہتے ہیں جو گوری، لمبی، چٹی، خوبصورت ذہین ہو، شوہر کو سمجھتی ہو اور کبھی جھگڑا نہ کرتی ہو۔'' باباجی نے جواب دیا ''اسے وہم کہتے ہیں پتر وہم! جبکہ میرے خیال میں اسے اچھا کالم نگار کہا جانا چاہیے۔

(لاہور میں منعقدہ تقریب میں پڑھا گیا)

مزاحِ راہ

☆ علی رضا احمد کا شگفتہ و فکاہیہ مضامین پر مشتمل تیسرا مجموعہ

☆ بقول ضیاء الحق قاسمی کہ ''علی رضا احمد کے سامنے ایک وسیع میدان پڑا ہے۔ ان کی شائع شدہ تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے مزاح نگار بن چکے ہیں۔

اعلیٰ امپورٹڈ کاغذ قیمت 300 روپے خوبصورت سرورق سے آراستہ

اُردو تحقیق صورتحال اور تقاضے

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل

پاکستان کے نامور سکالر ڈاکٹر معین الدین عقیل کی اُردو تحقیق کی موجودہ صورت حال اور اسے درپیش مسائل سے آگہی پر عمدہ کتاب، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا اور طالبات کی ضروریات کے لیے انتہائی ممد و معاون

قریباً 5 صد صفحات　　قیمت: 700 روپے

چولستان تاریخ و ثقافت

چولستان کی تاریخ و ثقافت کے حوالے سے ایک اہم کتاب۔ اس خطے کے حکمرانوں، صوفیاء، اولیاء اللہ، فنکاروں، رسم و رواج، تاریخی عمارتوں سے روشناس کرایا گیا ایک مختصر مگر جامع کتاب۔

پروفیسر جاوید عثمان شامی کے قلم سے۔ قیمت 300 روپے

القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

بُری شاعری سے کیا مراد ہے؟

ہرمن ہیسے، جرمن / کشور ناہید، اسلام آباد

ہرمن ہیسے 1877 میں جرمنی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی معاش ایک بک سیلر کی حیثیت سے شروع کی۔ اکیس سال کی عمر میں پہلا شعری مجموعہ شائع کیا۔ پانچ سال بعد ان کا پہلا ناول شائع ہوا جسے بے مثال شہرت نصیب ہوئی۔ اس کے بعد ان کے پانچ اور ناول شائع ہوئے۔ ہیسے کے انسان دوست رویوں نے آگے آنے والے ناولوں میں اور بھی زندگی اور ظہور حاصل کیا۔ اس زمانے میں ہرمن ہیسے نے تنقید اور نظمیں بھی لکھنا شروع کیں۔ 1946ء میں ہرمن ہیسے کو نوبل پرائز دیا گیا۔ 1962ء میں اپنی پچاسویں سالگرہ کے تھوڑے عرصے بعد ہیسے کا انتقال ہو گیا۔ زیر نظر مضمون سب سے پہلے ہیسے نے 1918ء میں لکھا تھا۔ 1945ء میں یہ مضمون دوبارہ لکھا۔ مضمون اس لحاظ سے مختلف ہے کہ "بری نظموں" کے بارے میں آج کل کسی نے سنجیدگی سے تنقید نہیں لکھی ہے۔ شاعر کا شاعری کا تجزیہ، بہت سے شاعروں کو خود تجزیاتی منزل پر لا سکتا ہے۔

ابھی جب میں دس برس کا تھا۔ سکول میں میں نے ایک نظم پڑھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے وہ شیکسپیئر کی نظم "طفل سن" تھی۔ یہ ایک ایسے بہادر لڑکے کے بارے میں تھی کہ جس نے لوگوں کی تیز بوچھاڑ میں جنگ میں حصہ لیا تھا کہ وہ بڑوں کے لیے گولے اُٹھا اُٹھا کر دیتا تھا یا دوسرے بہادرانہ کام کرتا تھا۔ ہماری کلاس یہ نظم پڑھ کر بہت متاثر ہوئی تھی اور جب استاد نے ذرا سے طنز کے ساتھ یہ پوچھا "کیا یہ اچھی نظم تھی؟" ہم بڑے غصے میں مل کر چیخے "جی ہاں" مگر استاد نے مسکراتے ہوئے سر ہلا کر کہا "نہیں...... یہ ایک بُری نظم ہے۔" استاد ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ہمارے عہد کے مذاق اور اسلوب کے مطابق وہ نظم بُری تھی کہ واضح اور عیاں نظم تھی۔ واقعی کم تر نظم تھی۔ مگر اس نظم نے ہم جیسے ہم عمر لڑکوں میں بے پناہ جذبہ بیدار کیا تھا۔

دس برس بعد یعنی بیس سال کی عمر میں میرے اندر یہ اعتماد پیدا ہو گیا تھا کہ نظم ایک دفعہ پڑھتے ہی میں بتا سکتا تھا کہ نظم بُری تھی یا اچھی۔ اس سے زیادہ سادہ بات تھی ہی کوئی نہیں۔ نظم پر ایک نظر، ایک دو مصروں کو دوبارہ پڑھنا اور نظریہ قائم کر لینا۔

یہ کئی دہائیوں پہلے کے محسوسات ہیں۔ اس عرصے میں میرے ہاتھوں سے لاتعداد نظمیں گزریں اور میری نظروں نے ان کو پڑھا ہے اور آج میں پھر اس بے یقینی کی منزل پر ہوں کہ جہاں مجھے نہیں معلوم کہ جو نظم مجھے دکھائی جائے اسے کوئی نام، کوئی حرف تعریف، کوئی حرف صداقت دوں کہ نہ دوں کہ زیادہ تر نئے شاعر اپنی نظمیں دکھا کر مجھ سے مُہر صداقت مانگتے ہیں اور پھر پبلشر کے لیے بھی مجھ سے ہی درخواست کرتے ہیں اور نوجوان شاعر اس وقت سخت دل برداشتہ اور حیران ہوتے ہیں جبکہ ان کا سینئر ہم عصر کہ جسے وہ بہت ہی تجربہ کار نقاد سمجھتے ہیں، یہ ثابت کرتا ہے کہ اسے تو ایسا کوئی تجربہ نہیں اور ان کی نظم یہ کہہ کر واپس کر دیتا ہے کہ خود کو اس نظم کی اہلیت پر کچھ کہنے کے قابل نہیں سمجھتا ہے۔ جو بات، میں بیس برس کی عمر میں دو منٹ میں کہہ سکتا تھا، وہ ہی نہ صرف مشکل بلکہ ناقابل اظہار ہو گئی ہے۔ علاوہ ازیں تجربہ، ایسی چیز ہے جو عمر کے ساتھ ساتھ، انسان یقین رکھتا ہے کہ خود بخود ہی آ جاتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کو تجربے کا ملکہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے سکول کے دنوں ہی میں اسے حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر ماں کے پیٹ سے حاصل نہیں کرتے تو اور پھر وہ لوگ بھی ہیں کہ جن میں سے ایک میں ہوں کہ جو پچاس، ساٹھ سال تک یا سو سال تک زندہ رہ کر مر جاتے ہیں اور ساری عمر "تجربے" کی منزل سے ناآشنا رہ جاتے ہیں۔

بیس سال کی عمر میں نظم کی شناخت کے بارے میں تیقن اس حقیقت پر مبنی تھا کہ اس وقت مجھے بہت سے شاعر اور نظمیں بہت پسند تھیں اور میں ہر نظم اور ہر کتاب کا تقابل کر کے تجزیہ کیا کرتا تھا۔ مقابل میں ان نظموں اور کتابوں کو رکھ کر کہ جو مجھے خاص طور پر زیادہ پسند تھیں، اگر وہ ان کے تقابل میں اچھی لگی تو اچھی تھیں ورنہ بیکار۔

آج بھی میرے چند پسندیدہ شاعر ہیں۔ کچھ تو وہی ہیں جنھیں میں نوجوانی میں پسند کرتا تھا۔ مگر آج میں اس شاعری کو معتبر نہیں سمجھتا کہ جو مجھے نوجوانی کے پسندیدہ شعراء کی یاد دلا دے۔

میرا ارادہ شاعر اور شاعری کے بارے میں عمومی بات چیت کرنے کا نہیں ہے۔ ہاں صرف "بُری نظموں کے بارے میں" میں خصوصیت سے کہنا چاہوں گا کہ جنھیں سب شاعر اور قاری (سوائے خود لکھنے والے کے) درمیانہ درجے کی شاعری سمجھتے ہیں اور اسے غیر ضروری بھی قرار دیتے ہیں۔ میں نے زندگی میں ایسی بُری نظمیں یہ جاننے کے باوجود کہ وہ بُری نظمیں ہیں اور کیوں بُری ہیں، یہ بھی جان کر، بڑی توجہ سے پڑھی ہیں۔ آج میں ان کے بارے میں قطعیت اور علم، ہر دوسری عادات اور ہر دوسرے علم کی طرح کچھ مواقع پر، اپنے آپ کو دوہرے معانی اور اشکال میں واضح کیا ہے۔ پھر ہر چیز سخت بور، خشک، مردنی زدہ اور چھیدوں سے بھری معلوم ہوئی۔ میرے اندر کسی نے اس ماحول کے خلاف بغاوت کی۔ بعد میں میں نے اسے علم کی دسترس میں شمار نہیں کیا بلکہ دور از کار رویوں میں شمار کیا۔ ایسا رویہ جسے میں پیچھے چھوڑ آیا تھا اور جس کی گزشتہ حیثیت کو اب میں قبول نہیں کر سکتا۔

آج بھی میرا یہ تجزیہ ہوتا ہے جو نظم کہ بلا خوف تردید بُری کہی جا سکتی ہے، میرا جی کرتا ہے کہ اس کی مدافعت کروں۔ اس حد تک کہ اچھے یا بہترین ہونے کے الفاظ پر بھی لوگ شک کرنے لگیں۔ یہ ایسے ہی

جذبات ہیں کہ جیسے کسی افسر، پروفیسر یا پاگل کے سامنے کبھی کبھی اظہار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ویسے تو عمومی طور پر ہر شخص کو بلا تخصیص یہ علم ہوتا ہے کہ ایک قابلِ ذکر افسر عوام کی پہنچ سے وراء فرد ہوتا ہے، خدا کا خاص فیض پانے والا، معاشرے میں خصوصی عزت و تکریم پانے والا اور اپنے ساتھیوں کو فائدہ پہنچانے والا ہوتا ہے۔ جبکہ ایک پاگل آدمی تو محض بیمار اور بدقسمت آدمی ہوتا ہے کہ جس کو بندہ، ترس کھاتے ہوئے برداشت کرتا ہے کہ اس پاگل آدمی میں، فرد کے خصائص، نابود ہوتے ہیں۔ مگر ایسے بھی دن آتے ہیں جبکہ ایک آدمی کو پروفیسر یا پاگل قسم کے افراد کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا پڑتا ہے۔ پھر ایک اور متضاد صورت سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ پاگل آدمی ایک خوش آدمی نظر آتا ہے کہ جو خاموش بھی ہوتا ہے اور با اعتماد بھی ہے، جو عقلمند بھی ہے، خدا کا محبوب بھی، انفرادی کردار کا مالک بھی، جس کی قناعت اور اعتقادات اپنے ہیں۔ دوسری جانب پروفیسر فضول درمیانی عقل و دانش کا حامل شخصیت و کردار سے ناآشنا، بے مغز عام آدمی معلوم ہوتا ہے۔

اسی قسم کی باتیں میرے ساتھ بھی ہوتی ہیں۔ خاص کر میری نظموں کے حوالے سے۔ یہ نظمیں مجھے اچانک میری نہیں لگتیں۔ ان میں مہک، انفرادیت، معصومیت سب کچھ واضح ہونے لگتا ہے۔ ان کی ظاہری غلطیاں اور کمزوریاں بڑی مسحور کن معلوم ہوتی ہیں۔ بڑی خوش کن اور دلربا لگتی ہیں۔ بہت سی اچھی نظموں کے مقابلے میں۔ تب کئی اچھی نظمیں تو عمومی معلوم ہونے لگتی ہیں۔

ویسے بھی جب ''اظہاریہ'' (Expressionism) اسلوب شعر میں فروغ پاتا ہے، ہم نئے شاعروں میں بھی اس اسلوب کے اثرات محسوس کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ اچھی یا خوبصورت نظمیں نہیں لکھتے۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ابھی بہت سی خوبصورت نظموں نے ذہنوں کے بطن سے جنم نہیں لیا ہے اور انہوں نے یہ نظمیں ابھی اس لیے نہیں لکھی ہیں کہ گزشتہ نسلوں نے صبر کا کھیل، کھیلنا شروع کیا تھا، وہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس خیال میں حق بجانب ہیں اور ان کی نظمیں اتنی ہی متاثر کن معلوم ہوتی ہیں جتنی کہ ''بری'' نظمیں لگا کرتی تھیں۔

اس کی دلیل ڈھونڈنی آسان بات ہے۔ بنیادی طور پر نظم مکمل اکائی ہوتی ہے۔ یہ ایک انخلاء ہے، چیخ ہے، ایک آہ ہے، ایک رویہ اور ردعمل ہے کہ ایک انسان جذبات کا شکار یا آگاہ ہونے سے خود کو بچا کر، نظم کی صورت میں اختیار کر دیتا ہے۔ سب سے پہلے بے اختیار لمحوں میں نظم کی شناخت نہیں ہو سکتی۔ پہلے نظم، صرف شاعر سے ہم کلام ہوتی ہے۔ یہ اس کی چیخ، اس کی آہ، اس کا خواب اس کی مسکراہٹ اور اس کی بے چینیوں کا اظہار ہوتی ہے۔ کون انسان کے بے خواب، خوابوں کا تجزیہ، منطقی طریقے پہ کر سکتا ہے۔ ہم شاعر جس بے چینی میں سر اور ہاتھ ہلاتے یا چلتے ہیں، اس کا ماجرا اور کون سمجھ سکتا ہے جو بچہ ہاتھ یا پیر کا انگوٹھا منہ میں ڈال کر ہنستا اور مطمئن رہتا ہے، اس کا رویہ اتنا ہی مدلل اور ذہانت آمیز ہوتا ہے جتنا کہ کسی مصنف کا کہ جو تحریر کی سوچ کے دوران اپنا قلم یا نب ایسے پھیلاتا ہے جیسے مور ناچتے ہوئے اپنے پر پھیلاتا ہے۔ کوئی ایک سے بہتر نہیں کرتا ہے اور کوئی باقی افراد سے زیادہ صائب نہیں ہوتا ہے۔

اب کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ ایک نظم، شاعر کا بوجھ کم کرنے اور اس کو آزاد تر کرنے کے علاوہ دوسروں کو بھی لطف دے سکتی ہے۔ ان کو متاثر کرکے، ان کو دل گرفتہ کر سکتی ہے کہ یہ ایک خوبصورت نظم ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ جو کچھ کہا گیا ہو، اکثر لوگوں کا مشترکہ تجربہ ہو۔ حالانکہ یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی ہے۔

اب یہاں پھر ایک نا ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کہ چونکہ ''خوبصورت نظمیں'' شاعر کو پسندیدہ شاعر بنا دیتی ہیں۔ بہت سی ایسی نظمیں وجود میں آ جاتی ہیں کہ جن میں سوائے خوبصورتی کے اور کوئی مضمون یا اسلوب فروغ دینے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے۔ یہ نظمیں دراصل قاری یا سامع کے نقطہ نظر سے بنائی جاتی ہیں۔ یہ تخلیقات نہ آپ کی روح کی پکار ہوتی ہیں نہ تجربے کا اظہار یا ردعمل۔ بلکہ کلیشے اور فارمولے کے مطابق گھڑے گھڑائے جذبوں کا اظہار عقلمند آدمی یا پاگل کے اشارے کی تقلید۔ یہ نظمیں عوام کے لیے گھڑی جاتی ہیں۔ یہ تقسیم و فروخت کے لیے تیار کی جاتی ہیں۔ وہ اپنے خریداروں کو ملتفت کرنے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ شاعر کو بڑی محبت اور سنجیدگی سے خود کو ان نظموں میں سامنے لانا نہیں پڑتا ہے۔ کوئی شخص ان کو پڑھ کر نہ لرزتا ہے نہ ہل جاتا ہے بلکہ ان نظموں کے لطف اور رواں ترنم میں جھوم جھوم جاتا ہے۔

کئی دفعہ یہ ''خوبصورت'' نظمیں سوال خیز اور قابلِ توجہ بالکل اس چیز کی طرح معلوم ہوتی ہیں جسے سدھایا اور سمجھوتہ کرنے کے قابل بنایا گیا ہو۔ جیسا کہ پروفیسر یا سرکاری افسر لگتے ہیں اور جب بھی ساری دنیا آپ سے خائف ہو اور آپ کا جی کرے کہ گلی کی بتیاں بھی توڑ ڈالی جائیں۔ مندروں کو آگ لگا دی جائے۔ ایسے دنوں میں یہی ''خوبصورت'' نظمیں اور پاکیزہ کلاسیکی ادب بھی، سنسر شدہ، سارا منظور شدہ اور بزدلانہ معلوم دیتا ہے۔ پھر انسان بُری نظموں کی جانب پلٹتا ہے، پھر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نظم بُری نہیں ہوتی ہے۔

مگر یہاں، نا اُمیدی انتظار میں رہتی ہے۔ بُری نظم کا پڑھنا، ایک عارضی خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ آپ کو بہت جلد، بہت کچھ مل جاتا ہے تو پھر پڑھنا کا ہے کو، کوئی شاعر، اپنے لیے تو بُری نظمیں تخلیق نہیں کرتا ہے۔ کبھی کوشش کرکے دیکھیں کہ بُری نظم تخلیق کرنا پڑھنے سے بھی زیادہ لطف دیتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ بہت اچھی اور خوبصورت نظم سے بھی زیادہ خوشی دیتا ہے۔

پابلونرودا اور گبریلا مسترال... تعارف وشاعری

عامر بن علی، جاپان

گبریلا مسترال 1889 میں پیدا ہوئی تو اس کے والدین نے اسے جو نام دیا وہ لوسیا دی ماریا تھا۔ لاطینی امریکہ کی یہ پہلی شخصیت جسے 1945 میں ادب کا نوبل انعام ملا، اسکے قلمی نام کی کہانی بھی اس کی شخصیت کی طرح دلچسپ ہے۔ پچیس سال کی عمر میں اس نے اپنے دو پسندیدہ شاعروں کے نام گبریل دی انیسو (Gabriele De Anunczio) اور فریڈرک مسترال (Frederic Mistral) سے اپنا قلمی نام گبریلا مسترال اخذ کیا۔ نام کی تبدیلی یا قلمی نام رکھنا اہل قلم میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ مگر مسترال کے واقعے میں اسکی اہمیت اس لئے بنتی ہے کہ 1909 میں اس کا عاشق جو ریلوے کا ملازم تھا اور عمر میں اس سے بڑا تھا، خودکشی کر کے اسے داغ مفارقت دے گیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ گبریلا مسترال کے نام کی تبدیلی کی وجہ یہی واقعہ بنا کیونکہ خودکشی کرنے والے رومیلیو اوریتا کو وہ اپنی پہلی محبت قرار دیتی ہے۔ اس کی شاعری میں ہمیں جہاں بنیادی طور پر محبت، بے وفائی، قدرتی مناظر، غم، ماں کی محبت اور سفر کے مضامین ملتے ہیں وہیں اسکے محبوب کی خودکشی کا واقعہ بھی جابجا اثر انداز ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ تعلیم مکمل کئے بغیر گبریلا مسترال نے تدریس کا پیشہ اختیار کرلیا۔ تدریس کا شعبہ اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کا باپ اور بہن بھی چونکہ سکول میں بچوں کو پڑھاتے تھے اس لئے پڑھانا اس کے گھر کی روایت بھی تھی۔ اس نے چھوٹی عمر میں ہی بڑے بڑے غم اٹھائے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ تین برس کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسکے والد کا انتقال ہو گیا اور اس کی پرورش بڑی بہن کے ہاتھوں ہوئی مگر جلد ہی وہ بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ ابتدائی زندگی کے ایام شدید کسمپرسی کے تھے۔ افلاس سے مسترال کیسے نبرد آزما تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ وہ صرف پندرہ سال کی تھی جب وہ نہ صرف اپنا بوجھ اٹھا رہی تھی بلکہ اپنی بیمار ماں کی دیکھ بھال بھی کر رہی تھی اور گھر کی واحد کفیل تھی۔ مالی پریشانیوں کے سبب ہی اس نے تعلیم بھی ادھوری چھوڑ دی تھی مگر اس کی بڑی بہن نے اسے اسسٹنٹ ٹیچر کی نوکری کوشش کر کے دلوادی تھی۔

ویسے بھی بیسویں صدی کی پہلی اور دوسری دہائی کے دوران چلی میں تربیت یافتہ اور تجربہ کار اساتذہ کی شدید کمی تھی اور مضافاتی علاقوں میں تو اساتذہ کی یہ کمی شدید تر تھی۔ اس لئے جو کوئی بھی پڑھانے کے لئے نوکری تلاش کرتا، اسکی تعلیمی قابلیت اور تجربے کی کمی اس کے لئے رکاوٹ نہ بنتی تھی اور اسے کسی نہ کسی سکول میں نوکری مل ہی جاتی تھی۔ فنکاروں میں بالعموم اور شاعروں کی طبیعت میں بالخصوص جو بے چینی پائی جاتی ہے وہ بے چینی مسترال میں بھی موجود تھی جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ 1906 سے لیکر 1912 تک کے عرصے میں اس نے تین مختلف شہروں میں رہائش اختیار کی گو کہ وہاں بھی پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ لاسرینا، آنتافو گاستا اور لاس آندلیس میں قیام کے دوران سنتیاگو بھی وہ مسلسل آتی جاتی رہتی تھی۔ 1918 میں اسے "پونتا رینا" کے ایک سکول کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا اور 1920 میں وہ تیموکو کے سکول میں پڑھانے لگی جہاں اسکی پابلونرودا سے پہلی ملاقات بھی ہوئی۔ اگلے سال اسے سنتیاگو کے ایک سکول کا سربراہ مقرر کرنے پر ایک تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ اعلیٰ طبقے کی لڑکیوں کے اس سکول میں تعیناتی کا تنازعہ بڑھتا ہی چلا گیا تو مسترال نے دل برداشتہ ہو کر 1922 میں میکسیکو کی وزارت تعلیم کی طرف سے ماہر تعلیم کے عہدے کی پیشکش قبول کرلی اور چلی کو خیرباد کہہ دیا۔ اسی سال نیویارک سے اسکی کتاب "تنہائی" شائع ہوئی جس نے گبریلا مسترال کا عالمی سطح پر زیادہ موثر انداز میں تعارف کروادیا۔

شاعری کے میدان میں اسے پہلی بڑی کامیابی 1914 میں ملی جب چلی کے قومی ادب ایوارڈ سے اسے نوازا گیا۔ یوں تو پندرہ سال کی عمر میں ہی اس نے کئی یاد رہنے والی نظمیں تخلیق کر دی تھیں اور وہ شائع ہو کر سند قبول بھی حاصل کر چکی تھیں مگر اتنی چھوٹی عمر میں "مردے کی ہڈیاں" کے نام سے مجموعہ کلام کی اشاعت پر ملک کا سب سے بڑا ادبی اعزاز حاصل کرلینا اس کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی دلیل ہے۔ یاد رہے کہ میکسیکو میں قیام کے دوران اس کا امریکہ بھی کافی آنا جانا رہا اور واشنگٹن میں اس نے پین امریکن یونین سے بھی خطاب کیا۔ یورپ بھی اس کی محبوب منزل تھا، اور سپین سے اس کو خصوصی لگاؤ تھا شاید اسی سبب سے اگلے شعری مجموعے کی اشاعت بھی سپین میں ہی ہوئی۔

1925 میں وہ چلی واپس لوٹ آئی اور تدریس کے شعبے سے اس نے ریٹائرمنٹ اختیار کر لی۔ گو کہ مسترال بارہ برس کی بھی نہیں تھی جب اس نے روایتی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا مگر وطن واپسی پر یونیورسٹی آف چلی نے اسے اعزازی پروفیسر کے عہدے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا۔ اسی سال لیگ آف نیشنز نے اسے خطاب کی دعوت دی جسے اس نے قبول بھی کیا۔ 1926 میں وہ فرانس منتقل ہوگئی اور پھر باقی زندگی اس نے خودساختہ جلاوطنی میں ہی گزاری۔ اس دوران اس کا اٹلی میں بھی قیام رہا جہاں مسولینی حکمران تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ مسولینی نے اسے وزارت کی پیشکش کی تھی جسے اس نے ٹھکرا دیا تھا۔ اس سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ فسطائیت کے خلاف تھی مگر وہ کمیونسٹ بہرحال نہیں تھی۔ مسترال کی زندگی ہمیں سیاست سے کتراتی نظر آتی ہے۔ اس کی خودساختہ جلاوطنی کی وجہ شاعرانہ بے چینی والا اباپی پن کے علاوہ سیاست سے دور رہنے کی خواہش بھی ہوسکتی ہے۔ باوصف اس کے کہ وہ ایک درد مند دل رکھتی تھی اپنی کتاب "TALA" کی تمام کمائی اس نے سپین کی خانہ جنگی میں یتیم ہونے والے بچوں کے نام کر دی تھی۔ بچوں سے اسے خصوصی محبت تھی جس کا اظہار اس کے اپنے الفاظ میں ہوتا ہے "اُس کا نام آج ہے، ہم بہت سی غلطیوں اور خرابیوں کے ذمے دار ہیں مگر ہمارا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے بچوں کو نظرانداز کر رکھا ہے، زندگی کے چشمے کو بھلا رکھا ہے۔ بہت سی چیزیں جن کی ہمیں ضرورت ہے، انتظار کرسکتی ہیں۔ مگر بچے انتظار نہیں کرسکتے ہیں۔ یہی وقت ہے جب اس کی ہڈیاں بن رہی ہوتی ہیں، اس کا خون بن رہا ہوتا ہے اور اس کے حواس خمسہ تشکیل پا رہے ہوتے ہیں۔ اس کو ہم یہ جواب نہیں دے سکتے کہ "کل" کیونکہ اس کا نام "آج" ہے۔ اپنی عمر کا آخری حصہ اس نے امریکہ میں گزارا۔ 1957 میں جب وہ دنیا سے رخصت ہوئی تو اس کی عمر 67 برس تھی۔

گبریلا مسترال آزادی اور تہذیب کا حصول تعلیم اور خدمت کے ذریعے ہی ممکن سمجھتی تھی اور اسی مقصد کے لئے اس نے شاعری کے ساتھ ساتھ زندگی بھر آزادی اور تہذیب کی ترویج کے لئے تعلیم دینے اور خدمت کے کام کرنے کو ایک روحانی فریضہ سمجھا اور ہمیشہ یہی سمجھا کہ دوسرا راستہ حیوانیت اور جنگل کی طرف واپس لے جاتا ہے۔

چلی میں پابلو نرودا اور گبریلا مسترال کے چاہنے والے عام زندگی میں عموماً متضاد قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ سیدھی بات کروں تو نرودا کا حلقہ اثر زیادہ تر سوشلسٹ، بائیں بازو یا پھر ترقی پسند سوچ رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہے جبکہ مسترال روایتی اشرافیہ، سرمایہ دارانہ نظام اور مغربی جمہوریت کے حامی لوگوں میں زیادہ مقبول ہیں۔ لاطینی امریکہ میں اگر آپ کسی پڑھے لکھے شخص کے سیاسی نظریات جاننا چاہیں اور براہ راست سیاست پر سوال بھی نہ کرنا چاہتے ہوں تو اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ صرف یہ پوچھ لیجئے کہ اس شخص کو گبریلا مسترال اور پابلو نرودا میں سے کون سا شاعر زیادہ پسند ہے؟ اگر جواباً نرودا کا نام آئے تو سمجھ لیجئے کہ یہ شخص ترقی پسند ہے اور مسترال کو پسند کرنے والا آدمی امید ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا حامی ہوگا یا کم از کم سوشلسٹ تو ہرگز نہیں ہوگا۔

پابلو نرودا کی پیدائش 1904 میں چلی کے جنوب میں واقع ایک چھوٹے سے شہر پارال میں ہوئی۔ اس کی عمر فقط دو ماہ تھی کہ اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا جس کے بعد اس کے والد نے دوسری شادی کر لی جس میں سے اس کا ایک سوتیلا بھائی اور ایک بہن پیدا ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اس نے اپنے آبائی شہر میں ہی حاصل کی اور مزید تعلیم کے حصول کے لئے وہ سنتیاگو منتقل ہوگیا۔ وہ صرف دس سال کا تھا جب اس کی پہلی نظم شائع ہوئی اور اپنی عمر کے بیس سال مکمل کرنے سے پہلے وہ عالمی سطح پر ایک مقبول شاعر بن چکا تھا۔ نرودا کے والد نے ہمیشہ اس کے لکھنے کے کام کی مخالفت کی اور اسے نصابی پڑھائی پر توجہ دینے کے لئے کہتا رہا مگر کئی دوسرے لوگوں نے اس کی حوصلہ افزائی بھی کی جن میں گبریلا مسترال بھی شامل تھی۔ سولہ برس کی عمر میں جب اس نے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا تو اس کا ایک مقصد اپنے والد کو چھپا دینا بھی تھا۔ یاد رہے کہ نرودا کا اصل نام نیفتالی باسو آلتو تھا۔ انیس برس کی عمر میں اس کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوگیا تھا اور وہ تب بیس برس کا تھا جب اس کی نظموں کا عہد ساز مجموعہ "محبت کی بیس نظمیں" اشاعت پذیر ہوا، جو کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور لاکھوں کی تعداد میں اس کی کاپیاں فروخت ہوئیں۔ مگر غربت نے اس کا ابھی تک پیچھا نہ چھوڑا تھا حالانکہ وہ عالمی سطح پر مانا ہوا شاعر اور ادیب بن چکا تھا۔ معاشی مجبوریوں کی وجہ سے ہی اس نے بحیثیت سفارت کار نوکری اختیار کر لی اور رنگون، کولمبو اور جاوا کے علاوہ سنگاپور متعین رہا۔ اسی دوران اس نے ایک جرمن خاتون سے شادی کر لی جو بنک میں ملازمت کرتی تھی۔

1971 میں ادب کا نوبل انعام پانے والے

نرودا کے متعلق کولمبیا کے معروف صحافی اور ناول نگار گارشیا مارکیز جو کہ خود بھی نوبل انعام یافتہ تھا کہا کرتا تھا کہ "بیسویں صدی کا کسی بھی زبان میں وہ سب سے بڑا شاعر تھا"، یہاں مسترال اور نرودا کی شخصیت کا ایک اور مشترک پہلو قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ مسترال کی طرح نرودا نے بھی اپنا قلمی نام اپنے پسندیدہ شاعر کے نام سے اخذ کیا تھا۔ چیک ریپبلک سے تعلق رکھنے والے شاعر جان نرودا سے وہ اتنا متاثر تھا کہ اپنے یورپ کے دورے کے دوران وہ خصوصی طور پر چیکوسلواکیہ گیا تھا تاکہ اس شاعر کی قبر پر پھول چڑھا سکے۔ یہ ایک الگ یادگار داستان ہے مگر اس کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

ایشیائی ممالک میں سفارتکاری سرانجام دے کر وہ واپس چلی لوٹا تو اسے پہلے بیونس آئرس اور پھر بار سلونا میں سفارتی عہدوں پر تعینات کیا گیا۔ بعدازاں وہ گبریلا مسترال کی جگہ میڈرڈ میں چلی کا قونصلیٹ مقرر ہوا۔ اس کی بیٹی مالوا مرینا کی پیدائش 1934 میں میڈرڈ میں ہی ہوئی جو اپنی مختصر سی آٹھ سالہ زندگی میں اکثر بیمار ہی رہی۔ اسی دوران سپین میں خانہ جنگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہاں اس کا حلقہ احباب زیادہ تر ترقی پسند سوچ کے حامل دانشوروں اور مصنفین پر مشتمل تھا۔ نرودا کے کمیونسٹ خیالات انہی دنوں ترتیب پائے اور جب سپین کے آمر جنرل فرانکو نے اس کے ادیب دوست گارسیا لورکا کو قتل کروا دیا تو اس کے نظریات کمیونزم کے متعلق مزید پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کر گئے اور وہ کھل کر جنرل فرانکو کے خلاف سوشلسٹوں کی حمایت کرنے لگا جس پر اسے نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔ انہی دنوں اس کی جرمن بیوی بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ 1938 میں مگر چلی میں اس کے دوست الیکشن جیت کر برسراقتدار آگئے اور اسے فرانس میں ہسپانوی مہاجرین کا مشیر مقرر کر دیا گیا جس عہدے کے متعلق نرودا کا کہنا تھا کہ "میری زندگی میں یہ سب سے مقدس مشن تھا جسے میں نے قبول کیا"

1940-1943 میں وہ میکسیکو میں چلی کا سفیر تعینات رہا۔ یہاں اس کی دوسری شادی ہوئی اور اپنی بیٹی کی موت کی اطلاع بھی اسے یہیں موصول ہوئی۔ اسی دوران اسٹالن حکومت کے مخالف لیون ٹراٹسکی پر قاتلانہ حملہ ہوا جو ان دنوں میکسیکو میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ نرودا پر الزام ہے کہ وہ اسٹالن حکومت کا حامی تھا اور اس نے ٹراٹسکی پر قاتلانہ حملہ کرنے والوں کو نہ صرف پناہ دی تھی بلکہ ان کو چلی کے ویزے جاری کر کے ملک سے فرار بھی کروایا تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جنگ عظیم دوم میں نازی جرمنی کی شکست میں اسٹالن کے کردار کی وجہ سے پابلو نرودا اس کا مداح تھا۔ 1953 میں نرودا کو اسٹالن امن انعام سے بھی نوازا گیا اور اسٹالن کی موت پر اس نے اسٹالن کے لئے ایک طویل مرثیہ لکھا تھا مگر ٹراٹسکی پر حملے میں ملوث ہونے کے الزام کی نرودا نے ہمیشہ تردید کی۔ ویزوں کے اجراء کے متعلق اس کا کہنا تھا کہ ایسا میکسیکو کے صدر کے کہنے پر کیا گیا تھا۔ یہاں پر یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ پابلو نرودا کی کردار کشی کے لئے امریکی سی آئی اے نے باقاعدہ ایک سیل قائم کیا تھا اور یہ کوئی افواہ یا پراپیگنڈا نہیں بلکہ اب امریکی حکومت سرکاری طور پر بھی اس خصوصی سیل کے وجود کی تصدیق کرتی ہے اس لئے ممکن ہے کہ نرودا کے اوپر عائد یہ الزام اور اس طرح کے کئی دوسرے الزامات حقیقت میں امریکی سی آئی اے کے تراشے ہوئے افسانے ہی ہوں۔ بالشویک انقلاب روس کے ہیرو ٹراٹسکی کی آپ بیتی جس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے اس میں بھی کہیں نرودا کے کسی ایسے فعل میں ملوث ہونے کا کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے۔

1945 میں وہ سینیٹر منتخب ہوا اور اس کے بعد اس نے باقاعدہ طور پر کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ وہ آنتافو گاستا سے پہلے سینیٹر منتخب ہوا اور کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اس کے بعد اختیار کی۔ یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ چلی میں سینیٹر براہ راست عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتے ہیں، پاکستان کی طرح بالواسطہ انتخاب کی بجائے سینیٹرز کا انتخاب امریکی طرز پر ہوتا ہے جس میں انتخابی حلقوں کی بنیاد پر حلقے کے لوگ انہیں منتخب کرتے ہیں۔

اسی سال وہ پیرو کے دورے پر بھی گیا جہاں اس نے لازوال نظم "ماچو پیچو کی بلندیاں" تحریر کی۔ یہ نظم انتہائی طویل ہے جس کے بارہ حصے ہیں جن میں سے آخری حصہ ترجمہ کر کے اس کتاب میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ میساچوسٹس یونیورسٹی امریکہ میں شعبہ تخلیقی آرٹ کے سربراہ پروفیسر مارٹن کا کہنا تھا کہ "ماچو پیچو کی بلندیاں" انسانی تاریخ میں سب سے بڑی سیاسی نظم ہے۔

1946 میں نرودا کو صدارت کے لئے کمیونسٹ امیدوار کی سیاسی مہم کا انچارج مقرر کر دیا گیا۔ 1948 میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی اور اس نے روپوشی اختیار کر لی۔ روپوشی کے دوران وہ تیرہ ماہ تک مختلف شہروں میں اپنے دوستوں کے گھروں اور تہہ خانوں میں چھپتا رہا کیونکہ

حکومت کے کارندے اسے گرفتار کرنے کے لئے جگہ جگہ چھاپے مار رہے تھے۔ایک سال سے زائدعرصہ کی یہ روپوشی اس طرح ختم ہوئی کہ وہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کرارجنٹائن فرار ہوگیا۔یہ سارا واقعہ نرودا نے نوبیل انعام وصول کرتے وقت اپنی نوبیل تقریر میں دہرایا تھا۔اگلے تین سال اس نے جلاوطنی میں گزارے۔

ارجنٹائن میں وہ اپنے ہم شکل ناول نگار دوست میگل، جسے بعدازاں ادب کا نوبیل انعام بھی ملا، اس کے پاسپورٹ پر پورا یورپ گھومتا رہا۔اسی دوران اس نے چین، ہندوستان، روس اور سری لنکا کے دورے بھی کئے۔میکسیکو میں قیام کے دوران اس کو وہاں کی حکومت نے شہریت دے دی۔اس کے بعد 1952 میں وہ اٹلی کے جزیرے کیپری میں اپنے ایک مورخ دوست کے ہاں رہائش پذیر رہا،نرودا کا یہ مختصر قیام بہت یادگار رہا جس پر 1965 میں ناول بھی لکھا گیا اور اس ناول پر بعدازاں 1994 میں فلم بنائی گئی۔"IL POSTINO" کے نام سے بننے والی یہ فلم جسے انگریزی میں "The Post Man" کے نام سے ڈب کیا گیا ہے، ہمیشہ یاد رکھی جانے والی فلموں میں سے ایک ہے۔1953 میں وہ واپس وطن پہنچا اور پھر اپنی موت تک زیادہ عرصہ وہیں قیام پذیر رہا۔اس میں سے صرف وہی عرصہ اس نے ملک سے باہر گزارا جب 1973-1970 میں اسے پیرس میں سفیر مقرر کیا گیا۔1969 میں اسے کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے ملک کی صدارت کا امیدوار منتخب کیا گیا مگر وہ اپنے دیرینہ دوست سالوا ور آیندے کے حق میں دستبردار ہوگیا۔فرانس میں سفیر کا عہدہ بھی اس نے آیندے کے کہنے پر قبول کیا تھا، جو انتخابات میں کامیاب ہو کر چلی کا صدر بن چکا تھا۔مگر وہ زیادہ عرصہ اس عہدے پر براجمان نہ رہ سکا۔امریکی سی آئی اے نے چلی کے فوجی جرنیلوں کے ساتھ مل کر 1973 میں منتخب حکومت کا تختہ الٹ دیا تا کہ کمیونزم کا راستہ روکا جا سکے۔اس آپریشن میں امریکی لڑاکا طیاروں اور اس کے فوجیوں نے باقاعدہ طور پر حصہ لیا تھا۔جنرل پنوچے نے فوجی بغاوت کی قیادت کی جس دوران منتخب صدر آیندے کو گولیاں مار کر قتل کر کے نامعلوم مقام پر دفن کر دیا گیا۔یاد رہے کہ یہ سرد جنگ کے عروج کا زمانہ تھا اور امریکہ ان دنوں دائیں بازو کے حامی ہر فوجی آمر کا مکمل کر ساتھ دے رہا تھا۔11 ستمبر 1973 کو جب مارشل لاء نافذ کیا گیا تو اس سے صرف تین دن پہلے پابلو نرودا کینسر کے علاج کی غرض سے ہسپتال میں داخل ہوا تھا۔

فوجی بغاوت کے دس دن بعد مشکوک حالات میں اس کا انتقال ہو گیا۔سرکاری طور پر کہا گیا کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوا ہے مگر لوگوں کی اکثریت کا ماننا ہے کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ویسے بھی وہ کینسر کے مرض کے علاج کے لئے ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا مگر اس کے انتقال کی وجہ ہارٹ اٹیک بتائی گئی جو کہ غیر منطقی سی بات لگتی ہے۔

2011 میں چلی کی ایک عدالت نے پابلو نرودا کی موت کا سبب جاننے کے لئے ایک تحقیقاتی کمیشن تشکیل دیا تھا جس کی تحقیقات ابھی تک جاری ہیں۔جنرل پنوچے نے اس کے جنازے کو عوامی اجتماع میں تبدیل ہونے پر پابندی لگا دی تھی۔شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا مگر ملک کے طول و عرض سے ہزاروں افراد نے کرفیو کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سنتیا گو کی گلیوں اور بازاروں کو کھچا کھچ بھر دیا تھا۔اپنی موت سے صرف ایک مہینہ قبل اس نے اپنی یادداشتیں مکمل کی تھیں جسے اس کی بیوی متلدے چھپا کر ملک سے باہر لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔یہ یادداشتیں دنیا کی کئی زبانوں میں بشمول اردو ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔نرودا کو اس کے ازلا نگرا میں ساحل پر واقع گھر کے باہر دفن کیا گیا اور اس کی بیوی متلدے بھی اس کے ساتھ ہی مدفون ہے۔اس کا یہ گھر بھی باقی دو گھروں کی طرح اب میوزیم میں تبدیل کیا جا چکا ہے۔

ان شعراء سے میرا تعارف چلی میں ایک ہی دن ہوا تھا۔جب میں سن ۲۰۰۰ء میں پاکستان سے ایم بی اے مکمل کر کے بسلسلہ کاروبار وہاں پہنچا تھا۔پابلو نرودا کا پورٹریٹ ایک کتابوں کی دوکان پر آویزاں دیکھا اور گبریلا مسترال کی تصویر پانچ ہزار کے کرنسی نوٹ پر موجود تھی جسے اسی دن میں نے بغور دیکھا تھا اور اس کے متعلق ابتدائی معلومات کا مجھ پر انکشاف ہوا تھا۔چلی، پیرو کے بعد جاپان میں چونکہ میرا قیام زیادہ رہا جہاں کے کرنسی نوٹوں پر یہ مشترک اور قابل تقلید بات نوٹ کی، جاپان کے دس ہزار ین کے کرنسی نوٹ پر بھی ایک شاعر کی تصویر ہے جو کہ جاپان کا سب سے بڑا کرنسی نوٹ ہے۔ان کے علاوہ بھی بے شمار ملکوں میں پڑھنے لکھنے سے متعلق لوگوں کی تصاویر کرنسی نوٹوں پر موجود ہیں۔

ان نظموں نے مجھے بے حد لطف دیا جس پر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ شاعری کا ذوق رکھنے والے باقی دوستوں کو بھی اس خوشگوار اور منفرد تجربے سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا جائے۔

گبریلا مسترال

Gabriela Mistral (1889 - 1957)

تین درخت

تین گرے ہوئے درخت
ایک شاہراہ کے کنارے پڑے ہیں
لکڑ ہارا انہیں بھول چکا ہے
اور وہ باتیں کر رہے ہیں
محبت میں مصروف
تین اندھے آدمیوں کی طرح
ڈوبتا ہوا سورج اگل رہا ہے
اپنا چمکیلا خون
ٹوٹی ہوئی شاخوں کے اوپر
اور ہوا ان سے خوشبو چرا کے لیے جا رہی ہے
ایک مڑی ہوئی ٹہنی
اس کا ایک بڑا باز و لرزتے ہوئے پتوں کے ساتھ
ایک دوسری ٹہنی کے زخموں کی طرف دیکھ رہا ہے
ایسے لگتا ہے جیسے دو آنکھیں ہوں
التجاؤں سے بھری ہوئی
لکڑ ہارا انہیں بھول چکا ہے
رات دبے پاؤں چلی آتی ہے میں ان کے ساتھ
رہوں گی رات بھر
میں اپنے سینے میں بھرلوں گی ان درختوں کا رس اور برادہ
وہ مجھے گرم جوش رکھے گا
اور نیا طلوع ہونے والا دن ہمیں دکھی سنگت میں پائے گا
خاموش
ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے

روشنی

روشنی جو وجاہت نچھاور کر رہی ہے
میں اس میں اپنے بچے کا چہرہ دیکھتی ہوں
اگر روشنی ناکام ہو جائے
وہ تمام چیزیں جو تم سے محبت کرتی ہیں بچے
پردہ کرلیں گے
اندھیروں میں گم ہو جائیں گے

اندھے
تمہیں ڈھونڈنے کے لئے
تمہیں ڈھونڈیں گے مگر کبھی نہ پا سکیں گے
یہ کھیلتی ہے
بدلتی ہے چالاکیاں اور مکاریاں کرتی ہے
اور یہ ہمیں کبھی بھی بھرپور نہیں ملتی
ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا ہماری خوشی ہے
مگر ہم جسے محبت کرتے ہیں وہ برستی روشنی ہے
بھاگ بھری روشنی
تمہاری پیدائش پر اس نے زمین سے تمہیں اٹھایا
اور مجھے رات کی تاریکی سے نکالا
روشنی تمہاری ماں ہے اسکی پیروی کرو

تنکے کا ٹکڑا

یہ جو کہ موم کی گڑیا تھی
مگر وہ لڑکی کسی طور پر بھی موم کی گڑیا نہ تھی
لیکن گندم کے بھوسے کا ایک ٹکڑا
جہاں دانوں کو بھوسے سے الگ کرتے ہیں
مگر حقیقت میں وہ گندم کے بھوسے کا ٹکڑا نہ تھی
مگر سورج مکھی کا اکڑا پھول جو سورج کے رخ پر چلتا ہے
وہ پھول تو نہ تھی، حالانکہ، وہ تھی
سورج کی مدھم، ناچتی، کھیلتی روشنی جو کھڑکیوں سے
چھیڑ چھاڑ کرتی ہے
وہ سورج کی کرن تو قطعاً نہیں تھی
مگر وہ تنکے کا ایک ٹکڑا تھی جو میری آنکھ میں چلا گیا
آؤ یہاں اور دیکھو کہ میں نے اسے کیسے کھو دیا
اس ایک بڑے آنسو میں، میرا حقیقی میلہ

پانی

چھوٹے تم اس قدر ڈرے ہوئے ہو پانی سے
جب کہ ہم یہاں ہیں
آبشار کی وجہ سے تم کانپ رہے ہو
خوشگوار آبشار جو کہ دیے چلی جاتی ہے
اس کی داتاری کبھی ختم نہ ہونے والی ہے
جھاگ کے ملبوس میں لپٹی ہوئی
یہ گرتی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گرتی چلی جاتی ہے
یہ پانی ہے، پانی
پانی ایک صوفی جو اپنے گھر کی طرف واپس جا رہا ہے
نیچے کی طرف یہ بہتی ہے اور جھاگ اڑاتی جاتی ہے
جھاگ جو ایک لمحے پاس آتی دکھائی دیتی ہے
اور اگلے لمحے دور چلی جاتی ہے
اور یہ پانی کو کھیت تک لے جاتی ہے
ماں اور بچے تک اسے ڈھوتی ہے
اس کے کنارے نشے میں دھت ہیں
اور یہ بہت پیئے ہوئے ہے
گائیں اور سانڈ ھا سے جی بھر کر پیتے ہیں
پھر بھی یہ ہمیشہ کے لئے رواں دواں پانی محبوب

پابلو نرودا

Pablo Neruda 1904 -1973

پھول کی پہیلی

فتح۔دیر سے آئی ہے۔میں نے نہ سیکھا تھا
کس طرح سے پہنچا جائے
کنول کی طرح کنویں پر
سفید پیکر لیے، چھنکتی سفیدی
بے حرکت مگر ابدیت کی مالک زمین
کبھی واضح تو کبھی دھندلے جسم سے ظاہر
گھنٹہ بجنے کی آواز تک
وہ چکنی مٹی
اک سفید کرن کے ساتھ یا پھر دودھیا اجالا لیے
اپنے کپڑے پھاڑ کر بے لباس، مٹی کا گہرا اندھیرا
کون سی چٹان پر جاتا پھول کا سو بھاؤ ہے
جب تک اس کی سفیدی کا پرچم آگے بڑھتا ہوا
توہین آمیز رات کے اندھیروں کو شکست دیتا ہوا
اور روشنی کی حرکت سے
"خود کو ایک حیران کن بیج میں بدلتی ہے

ہمیشہ

میں نہیں جلتا رقابت میں
جو منظر تم نے مجھے دکھایا اس سے
کسی مرد کے ساتھ آؤ
اپنے کاندھے کا سہارا دیتے ہوئے
سو آدمیوں کے ساتھ آؤ اپنے زلفوں میں لپیٹ کر
ہزار آدمیوں کے ساتھ آؤ اپنی چھاتیوں سے لیکر پاؤں
تک چمٹا کر
آؤ ایک دریا کی طرح
ڈوبے ہوئے آدمیوں سے لبریز
جو بل کھاتا ہوا وحشی سمندر میں جا گرتا ہے
ابدیت اور وقت کی لہروں میں
ان سب کو لے آؤ
اسی جگہ جہاں میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں
ہمیں ہمیشہ زمین پر تنہا ہی ہونا چاہیے
تمہیں اور مجھے
اکٹھے اپنی زندگی شروع کرنے کے لیے

غیر حاضری

میں نے مشکل سے ہی تمہیں چھوڑا ہے
جب تم میرے اندر اترتی ہو تو مورتی بن جاتی ہو
یا پھر کانپتی رہتی ہو
یا پھر بے سکون
مجھ سے ہی گھائل
نہیں تو پھر محبت سے سرشار
جیسے جب تمہاری آنکھیں
زندگی کے تحفے پر بند
جو بغیر کسی وقفے اور رکاوٹ کے میں تمہیں دیتا ہوں

پرندہ

یہ ایک پرندے سے ہوتی ہوئی دوسرے
پرندے تک پہنچی
پورے دن کا تحفہ
دن جو کہ ایک بانسری سے ہوتا ہوا
دوسری بانسری تک پہنچا
جس نے سبزہ اوڑھ لیا
پروازیں جنہوں نے ایک سرنگ بنا دی
جس میں سے ہوا گزرا کرے گی
اور وہاں تک جائے گی جہاں پرندے نیلی ہوا کو
توڑتے ہیں
اور گہری نیلی ہوا کے بعد رات آ جاتی ہے

کوزہ گر

تمہارے تمام جسم میں ہے
ایک مکمل پن یا پھر اک موزونیت جو میری تقدیر ہے
جب میں اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتا ہوں
تو مجھے جسم میں جگہ جگہ اک کمی سی محسوس ہوتی ہے
جو میری تلاش میں ہے، پیے
کوزہ گر نے تم کو بنایا ہے محبت اور چکنی مٹی سے
تمہارے گھٹنے تمہاری چھاتیاں
تمہاری کمر
میرے ہی جسم کے گمشدہ حصے ہیں
جیسے پیاسی زمین کی دراڑیں
جہاں سے وہ جدا ہوتی ہے
اپنی مکمل شکل سے ٹوٹتی ہے
اور دونوں اکٹھے ہوں تو
ہم ایک دریا کی طرح مکمل ہیں
جیسے ریت کا ایک مکمل ذرہ

جناب ظفر اقبال سے معذرت کے ساتھ

حسن عباسی

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو کشیدگی اور تناؤ کی کیفیت رہتی ہے اُس کو کم کرنے کے لیے شاعر اور ادیب ہمیشہ اپنا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ ادیب امن اور محبت کے سفیر ہوتے ہیں اس لیے سیاست دانوں کے برعکس اُن کا کردار ہمیشہ مثبت رہا ہے۔ دونوں ملکوں کے عوام اور شاعر اس خطے میں امن کے خواب دیکھتے آئے ہیں اور اس کے لیے حتی المقدور کوششیں بھی کرتے رہے ہیں۔ مشاعرہ برصغیر پاک و ہند کی مشترکہ تہذیب کی شاندار روایت کا نام ہے۔ لہٰذا دونوں ملکوں کے شعراء مشاعروں میں شرکت کے لیے ایک دوسرے کے ملکوں میں آتے رہتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے بھارت سے خوشبیر سنگھ شاد اور رنجیت چوہان ''عالمی امن مشاعرے'' میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لائے۔ میری ان دونوں شعراء سے گزشتہ برس دہلی اور ممبئی کے مشاعروں میں ملاقات ہو چکی تھی۔ لاہور میں بوقت ملاقات مجھ سے انھوں نے ظفر اقبال سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ ظفر اقبال کے حوالے سے جو محبت اور عقیدت اُن کی آنکھوں میں تھی اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اسی وقت ظفر صاحب کو فون کیا اور مہمان شعراء کے جذبات اُن تک پہنچائے تو انھوں نے علالت کے باوجود ہمیں گھر مدعو کر لیا۔ دونوں مہمان شعراء کی خوشی دیدنی تھی۔ ظفر صاحب سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ چائے کے دوران دونوں ملکوں کی ادبی فضا اور شاعری کے حوالے سے گفتگو بھی ہوئی۔ مختصر شعری نشست بھی ہوئی بلکہ جب میں غزل سنانے لگا تو ظفر صاحب نے انڈین شعراء کو مخاطب کر کے کہا میں آپ کو حسن عباسی کے دو شعر سناتا ہوں اور یہ دو شعر سنائے:

اگر میں سانس لیتا ہوں یہاں پر
تو اس کی پوری قیمت دے رہا ہوں

....

اکٹھے ہنسنا، اکٹھے رونا سکھا دیا ہے
ہمیں محبت نے ایک جیسا بنا دیا ہے

اپنے اشعار اُن کی زبانی سن کر مجھے خوشی تو بہت ہوئی مگر حیرت نہیں ہوئی۔ کیونکہ ظفر اقبال کو جو لوگ جانتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ اچھا شعر جو اُن کے معیار کے مطابق اچھا ہو چاہے کسی سینئر کا ہو یا نوجوان کا اُسے نہ صرف اپنے کالم کی زینت بناتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی سناتے ہیں۔ بہر حال اُس دن ظفر صاحب کے گھر خوب محفل جمی۔ وقتِ رخصت خوشبیر سنگھ شاد نے اپنے دو شعری مجموعے بھی ظفر صاحب کو پیش کیے۔ اس ملاقات کے دو دن بعد ان کا کالم شائع ہوا۔ جس میں انھوں نے مہمان شعراء خاص کر خوشبیر سنگھ شاد کی شاعری سے متعلق اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ بحیثیت سینئر شاعر اور نقاد کے وہ اس کا حق رکھتے ہیں اور یقیناً اُن کی رائے بہت اہم ہے۔ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ اگر آپ کو کسی کی شاعری پسند نہیں تو اُس کی تضحیک کر کے اُسے اخباری کالم میں یہ بتایا جائے۔ جن قارئین نے کالم نہیں پڑھا اُن کے لیے میں کچھ حصہ یہاں نقل کر رہا ہوں۔

''حسن عباسی کے ساتھ ایک غیر معروف اور بے حد معمولی بھارتی شاعر بھی تھا۔

دونوں شعراء یہاں ڈاکٹر صغرا صدف کی دعوت پر پلاک کے ایک پنجابی مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے، اُٹھتے ہوئے بتایا کہ اسلام آباد بھی جانا ہے جہاں کشور ناہید نے بلایا ہے۔ کشور ناہید وہ ہستی ہے جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی اور کسی اور کی شاعری اُسے مشکل سے ہی پسند آتی ہے۔ بلکہ اُس کا کہنا یہ ہے کہ ظفر اقبال یونہی ایسے ویسے شاعروں کی مشہوری کرتا رہتا ہے۔ اب وہ خوشبیر سنگھ شاد کی مشہوری کرنے والی تھیں......

سیدھی بات ہے کہ اگر یہاں سے بھارتی خوشبیر سنگھ شادوں کو دعوت نامے نہیں جائیں گے تو وہاں سے ہمارے خوشبیر سنگھ شادوں کے لیے دعوت نامے کیسے آ سکتے ہیں۔''

وضاحت کرتا چلوں کہ یہ دونوں شعراء ڈاکٹر صغرا صدف یا پلاک کی دعوت پر نہیں آئے تھے اور نہ ہی کسی پنجابی مشاعرے میں آئے تھے۔ بلکہ ''وجدان'' کے زیرِ اہتمام ''عالمی امن مشاعرے'' میں آئے تھے۔ رنجیت چوہان جنھیں ظفر صاحب نے بے حد معمولی اور غیر معروف شاعر کہا اور اُس کا نام لکھنا بھی گوارا نہیں کیا اُس نے صرف اپنی ایک غزل سنائی تھی جس کے پانچ اشعار تھے۔ اُن اشعار کی بنیاد پر انھوں نے اپنے کالم میں اُسے بے حد معمولی درجے کا

شاعر قرار دے دیا۔ قمر رضا شہزاد کی طرح اُس سے ۲۱ غزلیں منگوا کر کوئی فیصلہ صادر کرتے تو مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی۔ بہر حال ظفر صاحب ہمارے سینئر شاعر اور نقاد ہیں اور اس مقام پر ہیں کہ کسی کی شاعری سے متعلق کچھ بھی رائے اپنے کالم میں دیں مجھے ان سے اختلاف نہیں۔ بس حیرت ہے اور اس بات پر بھی میں حیران ہوں کہ ظفر صاحب گزشتہ پچاس سال سے بھارت نہیں گئے۔ مگر انھوں نے ایسے شخص کو بڑی آسانی سے غیر معروف لکھ دیا ہے جو کہ دہلی ممبئی اور انڈیا کے دیگر شہروں میں کئی سالوں سے عالمی مشاعرے کرا رہا ہے۔ بلکہ وہاں کی ادبی محفلوں کی جان ہے اور پاکستان سے نامور شعراء اُس کے مشاعروں میں شریک ہو چکے ہیں۔ وہ کراچی کی عالمی کانفرنس میں بھی آ چکا ہے اور پھر خوشبیر سنگھ شاد جس نے نہ صرف اُردو زبان سیکھی بلکہ بھارتی حکومت اُس کی شاعری کے اعتراف میں اُسے بیشتر سرکاری اعزازات سے نواز چکی ہے۔ وہ دنیا بھر میں بھارت کی نمائندگی کرتا ہے اور مشاعرے پڑھتا ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان دونوں شاعروں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے تھی جیسا کہ لاہور کی عوام نے مشاعرے میں کی۔ اگر اتنا حوصلہ نہیں تو کم از کم تضحیک نہیں کرنی چاہیے۔ خاص کر جبکہ پاکستان اور بھارت کا معاملہ ہو ادیب ہی تو اُمید کی آخری کرن ہیں۔ اگر وہ بھی ایسا رویہ اپنائیں گے تو فاصلے اور بڑھتے جائیں گے۔ اگر کسی کو کسی کی شاعری پسند نہیں آتی تو وہ اسے فون پر بھی بتا سکتا ہے یا اُس کے سامنے بھی اظہار کر سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ کالم میں ہی اُسے بتایا جائے اور اگر کالم میں ضروری ہے تو سلیقے سے بھی کہا جا سکتا ہے۔ خوشبیر سنگھ شاد اور رنجیت چوہان اس کالم کو پڑھ کر کافی دُکھی تھے۔ چونکہ وہ میرے ساتھ ظفر صاحب سے ملنے گئے تھے اس لیے میں اُن سے معذرت خواہ ہوں اور ظفر اقبال صاحب سے بھی معذرت کے ساتھ یہ گزارش کرتا ہوں کہ وہ بڑے ادیب ہیں۔ لہٰذا اُن کو اپنے کالم میں بھی بڑے ادیبوں جیسا رویہ روا رکھنا چاہیے۔

❁❁❁

ظفر اقبال کے نام

اُن کا آنا بھی عین ممکن ہے
اور بہانہ بھی عین ممکن ہے
اس طرح آنسوؤں کے پردے میں
مسکرانا بھی عین ممکن ہے
اک تعلق ہے اجنبیت کا
دوستانہ بھی عین ممکن ہے
چھپ چھپا کے وہ سامنے جب ہوں
منہ چھپانا بھی عین ممکن ہے
اس کی محفل میں لے چلیں پڑے
کچھ سنانا بھی عین ممکن ہے
اس گلی میں کیا نہیں ممکن
عاشقانہ بھی عین ممکن ہے
عین ممکن ہے رت جگا ثاقب
ہیر گانا بھی عین ممکن ہے

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ چودہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے مارچ 2015 کا شمارہ حاصل کریں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

فکرو جہان دگر

تآزاو کاڑوی

کہا جاتا ہے کہ شاعر ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ کم از کم مرزا شاہد بیگ کے بارے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ شاعر نہیں۔ شاعری یا نثر نگاری کا دارو مدار الہامیت پر ہوتا ہے۔ یہ موقع قدرت مہیا کرتی ہے۔ الفاظوں کا کسی بھی ذہن میں اُترنا قدرت کی ودیعت کہلاتا ہے اور پھر ہر وہ شاعر یا ادیب اپنی طرف سے جتنی بھی انفرادیت قائم کرتا ہے اُتنا ہی مقبولیت کی سند حاصل کرتا ہے۔ شاہد بیگ صاحب قانون کے ڈگری ہولڈر ہونے کے ساتھ ساتھ نہ صرف ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں بلکہ خود طبع آزمائی بھی کرتے ہیں۔ یوں تو وہ کافی عرصہ سے ادبی مشاغل میں مصروف ہیں مگر وہ ادبی محافل سے دور رہے اور اب ان کا پہلا شعری مجموعہ ''میری فکر میرا جہاں'' منظر عام پر آ گیا ہے۔ ان میں شاعری کی تمام تر صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جس لگن اور شوق سے اس صنف میں انہوں نے قدم رکھا ہے ان کے لیے کچھ بعید نہیں کہ جلد ہی حلقہ یاران ادب میں اپنی حیثیت منوالیں گے۔ ان کے ہاں الفاظ کا وافر ذخیرہ ہے تو نئے مظامین کی بھر مار اور خیال و فن پر عبور حاصل ہے۔

شاہد بیگ اُلجھے ہوئے خوابوں اور ان خوبوں کو سلجھانے کا شاعر ہے۔ کسی بھی فطری شاعر کی طرح شاہد بیگ یہ کام کسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے جذبے خود رو پھولوں کی طرح ہیں جو کسی بھی زرخیز زمین کے علاوہ صحراؤں اور چٹانوں کا سینہ چیر کر از خود سطح زمین پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ ان کے اچھوتے خیال کے ساتھ الفاظ کا چناؤ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ شاہد بیگ اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہے اور یہی صلاحیت ان کی شاعری کو دو آتشہ بنا دیتی ہے۔ شاہد بیگ شعر کی وادی میں پورے انہماک اور ذوق شوق سے گرمِ سر ہیں ان کا دل درد کی دولت سے آشنا ہے اور اس کا حرف حرف شدت احساس سے تابناک بھی ہے۔

شاہد بیگ نے اپنے شعری مجموعہ ''میری فکر میرا جہاں'' کے ذریعے منکشف کیا ہے کہ ایک اچھے اور کامیاب شاعر کا پہلا مجموعہ اس کے مستقبل کا حقیقی نقیب ہوتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ شاہد بیگ کی شاعری میں ہمارے دور کے وہ تمام وساوس اور تمنائیں موجود ہیں جو ہمارے دور کے حساس ذہنوں کو بیدار رکھتی ہے۔

نئے لکھنے والوں کا بنیادی وصف یہ ہوتا ہے کہ وہ تازہ مضامین لے کر آتے ہیں جو شعری اُفق کو مزید تابناک کر دیتے ہیں۔ شاہد بیگ بھی انہی تازہ کار شاعروں میں سے ہیں۔ غزل میں بھی شاہد بیگ نے روایت اور جدت کے امتزاج سے اپنے فنی سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی موجودگی کا نہ صرف احساس دلایا ہے بلکہ اپنی پہچان بنانے کی بھی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ مجھے اُمید ہے اگر وہ اس طرح کے اشعار مسلسل کہتے رہے تو اس کی پہچان کا عمل آسان ہو جائے گا۔

شاعر اپنی بے خیالی کو ہم سفر بناتے ہوئے خواب دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے یعنی اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے اس دھرتی میں ایک قطعہ مانگ رہا ہے۔

رومان پروری بھی غزل کا ایک حُسن ہے کتنی بھی جدت اختیار کرتے جائیں مگر روایت سے کٹ کر نہیں رہ سکتے۔ اکثر مشاہدے میں آیا ہے پورے کا پورا فلسفہ پر مبنی ہوتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں روایتی شعر مل ہی جاتا ہے۔ میری مراد رومانیت سے ہے۔ میں سمجھتا ہوں رومانیت سے منہ موڑنا فطرت سے منہ موڑنا ہے۔ فطرت میں حُسن اور حُسن کی رعنائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ جیسے شاہد بیگ بھی اس روایت سے جُڑے نظر آتے ہیں۔

بے شک شاہد بیگ نے اپنے فن کے عشق سے اپنے فن کو نگینہ غزل سے سجا کر پیش کیا ہے۔

یہ شعر کس کیفیت میں لکھا گیا ہوگا۔ کہنے کو کچھ نہیں بس اتنا ہی کہوں گا کہ انسان...... بے شک حقیر ہے۔

میں شاہد بیگ کو اپنے پہلے اُردو شعری مجموعہ ''میری فکر میرا جہاں'' کی اشاعت پر دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں۔ اُمید کرتا ہوں کہ اپنی فکروں کے جہاں ہم پہ وا کرتا رہے گا۔

طنز و مزاح

ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں

حسین احمد شیرازی، لاہور

کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے، ہمارے دفتر کے ظلِ الٰہی کا مغز گھوما تو اس نے شدید سردی میں اپنے نورتنوں کی محکمانہ کانفرنس کا انعقاد ایک پہاڑی مقام پر کر دیا تاکہ ہم پر ''پہاڑ کی چڑھائی اترائی، دونوں پر لعنت'' کے اسرار و رموز عیاں ہو جائیں۔

کانفرنس کے دوسرے روز ہمارے ساتھی عقیل کو دل کا دورہ پڑا تو اس ویرانے میں سب ہمراہیوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ایک دوست نے ناشتے کی میز پر کسی ڈاکٹر نصیر اور اس کی بیوی کو دیکھا تھا۔ ہوٹل سٹاف کی مدد سے اس ڈاکٹر کو ڈھونڈ کر لایا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت تسلی تشفی دی کہ کوئی پریشانی کی بات نہیں کہ اس مقام پر اس کے علاوہ اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔ پھر پریشان ہو کر ہم نے کسی کا کیا بگاڑ لینا تھا کہ اس فتنے کا سرغنہ مہابلی تو ہمارے شر کی حدود سے کوسوں دور تھا کیونکہ زمین پر بیٹھ کر ستاروں کی مخلوق پر پتھر پھینکنے والے خود ہی زخمی ہوتے ہیں اور کیچڑ میں پتھر یا لاٹھی مارنے والے صرف اپنا حلیہ اور لباس خراب کرتے ہیں، کیچڑ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ بہر کیف ڈاکٹر نصیر کے اس اعلان کے بعد اس کمرے میں ایمرجنسی کے اختتام اور پکنک کے دوبارہ آغاز کی کھلبلی مچ گئی کہ دل کا دورہ جس کمرے میں پڑا تھا، وہ ٹلن پارٹی کے لیڈر نثار کا تھا۔

اس اثناء میں شام کا دھندلکا گہری تاریکی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مریض کا معائنہ ختم کر کے ڈاکٹر صاحب نے اجازت طلب کی تو نثار:

''خدا کا شکر ہے ورنہ گزرتی کیسے شام
شراب جس نے بنائی اسے ہمارا سلام

گنگناتے ہوئے ڈاکٹر کو اپنے ہونٹوں پر خشک زبان پھیرتے اور پھر منہ سے رال ٹپکتے دیکھ کر بولا:

ذرا سی دیر جو ہو جائے گی تو کیا ہو گا
گھڑی گھڑی نہ اُٹھاؤ نظر گھڑی کی طرف

اس کے ساتھ اس نے بوتل، گلاس وغیرہ نکال کر ساقی گری کا آغاز کر دیا تو ڈاکٹر صاحب بولے: ''نہیں نہیں، میری بیوی ساتھ ہے اور اس نے یہاں آتے ہوئے سامان میں سے شراب نکال دی تھی کہ بس دو دن کے لئے تو جا رہے ہیں، وہاں بھی یہ سوتن ساتھ ہو گی۔''

نثار: ''صاحب! ردِ قدح نہ کریں، یہ مے ہے کسی کی تے نہیں ہے، ایک لے لیں۔ ذرا سا تو ہے۔

ساقی کا دل نہ توڑیں گے ترکِ شراب سے
حاصل کسی طرح ہو غرض ہے ثواب سے

ڈاکٹر: ''چلیں ایک کا کیا پتہ چلے گا۔ لیکن ذرا ''ڈبل'' بنا دیں۔''

گلاس ان کے قریب لایا گیا تو انہوں نے شراب کی بجائے دوائی پینے کے انداز میں اسے یہ کہتے ہوئے حلق میں انڈیل لیا کہ ''گناہ ثواب کی خاطر ثواب ہے ساقی''...... اس کے ساتھ ہی کہاں تو وہ صوفے کی سیٹ کے آخری کونے پر اٹکے ہوئے تھے اور اب ان کی کمر صوفے کی پشت سے جڑی ہوئی تھی۔

انہیں دوسرا جام لینے کو کہا گیا تو کہنے لگے:
''نہیں نہیں، ایک بھی ضرورت سے زیادہ تھا۔''

اب محفل بھی رنگ پر آتی جا رہی تھی۔ ایک صاحب بولے: ''ہمارے ہمسائے ملک میں تو مہمان بھگوان سمان ہوتا ہے، آپ میزبان کا دل توڑ کر اچھا نہیں کر رہے۔ بلھے شاہ نے کہا ہے کہ کسی کا دل توڑنا اچھی بات نہیں کیونکہ دل تو رب کا مسکن ہے۔''

ایک اور آواز آئی: ''ہمارا دل رکھنے کے لئے بقدر اشک بلبل پیا رہی سہی۔''

اس پر ڈاکٹر صاحب ''چلیں ایک یا دو میں کیا فرق ہے'' کہتے ہوئے دوسرا جام بھی غٹاغٹ پی گئے جسے ستم ظریف ساقی نے ''پیالہ'' بنا دیا تھا اور اب ڈاکٹر صاحب کا سر بھی صوفے کی پشت پر گرا پڑا تھا۔ دوستوں نے پھر مشورہ دیا کہ ایک اور لے لیں تو بولے: ''آپ مروائیں گے۔ میری بیوی انتظار کر رہی ہے اور آپ کو اندازہ نہیں کہ وہ کتنی ظالم ہے۔'' اب یہ بھی ہلکے ہلکے باغیانہ سرور میں آ رہے تھے۔

ایک آواز: ''ہمیں سب پتہ ہے، یہاں سب شادی شدہ مظلوم ہی بیٹھے ہیں۔ فطرت دراصل ''پاگل'' بنانے گی تھی لیکن غلطی سے ''بیوی'' بنا دی۔ جناب پاگلوں سے ڈرتے نہیں...... پھر ظلم کے خلاف بغاوت تو عین عبادت ہے۔ پی لیجئے۔''

ایک اور آواز آئی: ''سنو بھائیو مجھ سے دلچسپ قصہ سنو۔ ایک آدمی میڈیکل سٹور پر گیا اور زہر مانگا۔ سٹور والے نے سرکاری اجازت نامہ طلب کیا تو اس نے دو نکاح نامے سامنے رکھ دیئے۔ اس پر سٹور والے نے اپنے معاون کو کہا ''اس شخص کو زہر کی بڑی بوتل دو۔''

ڈاکٹر صاحب: ''اچھا! اب پتہ تو چل ہی جانا ہے اور جھگڑا ابھی ہونا ہے تو میں آپ کا دل کیوں توڑوں۔''

تین ڈبل پیگ چڑھ جانے کے بعد اب اگر ہوٹل سطح سمندر سے سات ہزار فٹ بلند تھا تو یہ کم از کم بیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے تھے۔ ہمارے دوست رضوی کمرے میں آئے تو جان نہ پہچان، ان کو دل کا دکھڑا سنانے لگے: ''بس آج میں مارا گیا۔ دیکھیں دیر بھی کتنی ہوگئی ہے اور میری بیوی نے فوراً پہچان لینا ہے کہ اتنی دیر میں ضرور گڑبڑ کی ہے۔''

نثار: ''آپ بہانہ کر دیں کہ مریض دیکھنے میں دیر ہوگئی تھی۔''

ڈاکٹر: ''میری شادی کو 19 سال ہوگئے ہیں اور اب ایک ایک کر کے میرے تمام بہانوں کا مکمل پوسٹمارٹم بلکہ ڈی این اے ٹسٹ بھی ہو چکا ہے۔ صرف میری مصروفیات کی حد تک میری بیوی جھوٹ پکڑنے والی مشین کا انسانی ورژن ہے اور اس معاملے میں اس کی کم بخت یادداشت اتنی خراب ہے کہ اسے ہر چیز یاد رہتی ہے۔''

نثار: ''چلیں ہم کہہ دیں گے کہ آپ مریض کی ''ای سی جی'' کے لئے ہمارے ساتھ قریبی شہر کے ہسپتال چلے گئے تھے۔''

ڈاکٹر: ''میری بیوی کو معلوم ہے کہ نزدیک ترین ''ای سی جی'' والے شہر کے واپسی سفر کے لئے چار پانچ گھنٹے چاہئیں۔ پھر مجھے رات بارہ بجے اپنے کمرے میں جانا پڑے گا۔''

اسی ردوکد میں ڈاکٹر صاحب دو اور گلاس خالی کر چکے تھے۔ جاپانی کہاوت کے مطابق پہلے آدمی شراب پیتا ہے، پھر شراب، شراب پیتی ہے اور آخر میں شراب آدمی کو پیتی ہے۔ یہاں یہ ''آخر'' آ چکی تھی کہ وہ بار بار ہاتھ ملتے ہوئے یہی فقرہ دہرا رہے تھے ''بس ڈاکٹر! آج تو واقعی مارا گیا۔'' کسی نے پوچھا کہ اتنی ظالم بیوی انہیں ملی کیسے تو پھٹ پڑے: ''ملی نہیں، میرے سر تھوپی گئی تھی۔ میری بیوہ ماں نے الٹی میٹم دیا تھا کہ جہاں میں کہتی ہوں وہاں شادی کرو ورنہ میں واپس گاؤں چلی جاؤں گی...... اور پھر شادی کے بعد میں نے بیوی کے ماتھے پر ڈیڑھ انچ سائز کے زخم کا تذکرہ کیا تو والدہ بولیں کہ بیٹا تمہیں تو پتہ ہی ہے کہ میری بینائی بہت کمزور ہے...... توبہ توبہ۔ میری بیوی شراب کو سوتن کہتی ہے۔ مجھے شراب کی عادت میرے سسر نے ڈالی تھی۔ پہلے وہ مجھ سے منگواتا تھا۔ پھر وہ مجھ سے جام بنواتا تھا اور پھر مجھے زبردستی پلاتا تھا۔ اس منگوانے، بنوانے اور پلانے میں میرا بیڑہ غرق ہوا ہے چنانچہ میں تو اسے کہتا ہوں کہ یہ شراب تمہاری سوتن نہیں، میکے والی ہے...... آپ میری بیوی کو دیکھیں تو اس کے ماتھے پر صاف پڑھا جا سکتا ہے کہ میں حکومت پاکستان سے بنام ''احمق'' رجسٹرڈ ہوں لہٰذا مجھے اسی نام سے لکھا، پکارا اور بلایا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو بے وقوف بے شک بنا دے لیکن بے وقوفوں جیسی شکل نہ دے۔ ماشاء اللہ میری بیوی میں یہ دونوں خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ اگر ارسطو، سقراط اور افلاطون آج زندہ ہوتے تو اس کی شاگردی کے فارم حاصل کرنے کے لئے یونان سے یہاں آ جاتے۔ مجھے یقین ہے کہ کوڑھ مغزوں کے چہرے روشن ہوتے تو میری بیوی کا چہرہ سورج سے بھی زیادہ چمکتا دکھائی دیتا اور ڈارون اس سے مل لیتا تو انسان کو بندر کی بجائے اُلو یا گدھے سے منسلک کر دیتا۔ ہمارے جاننے والے اس کے بارے میں ''یہ تو بہت سادہ ہیں'' کہتے ہیں تو یہ اسے تعریف سمجھ کر پھولی نہیں سماتی حالانکہ اس کا مطلب ''بدھو'' ہے۔ واضح ہے کہ کسی بھی فرد یا گروپ کی تباہی کے لئے تھوڑی عقل اور بے تحاشا اعتماد کے امتزاج کے سوا اور کیا چاہئے۔ چلیں میری زندگی تو خراب ہونی ہی تھی، آپ میرے بچوں کی عادات دیکھیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ان کی ماں ان کے بچپن میں ہی وفات پا گئی تھی اور انہیں کسی پھوہڑ خادمہ نے پالا ہے!''

ایک صاحب مداخلت کرتے ہوئے

پکارے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ایک اور صاحب اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے بولے: ''میں نے ایک دن اپنی بیوی سے کہا کہ تم اچھی ہم سفر تو ہو مگر بہت اچھی کیوں نہیں بنتی۔ اس تبصرے کے بعد اب اس کی پوری کوشش ہے کہ میں اپنی رائے تبدیل کرلوں...... لیکن وائے قسمت یہ تبدیلی ''اچھے'' سے ''خراب'' کی طرف سفر کر رہی ہے۔''

ڈاکٹر صاحب اپنی بات جاری رکھتے ہوئے: ''آپ اس کی عقل ملاحظہ کریں کہ اس نے موبائل فون گم جانے پر عمل کی جانے والی ہدایات بھی اسی فون میں محفوظ کی ہوئی ہیں۔ اس کا دماغ 12 سالہ بچے کی طرح، تن و توش 60 سالہ بڑھیا کی مانند، اخراجات کا جنون کسی بگڑے ہوئے رئیس جیسا اور جذبات کسی مرحوم بدروح والے ہیں۔ اس کے فرمودات کا بے ہنگم پن دیکھئے کہ وہ کہتی ہے کہ اس کا بیان کردہ فلسفہ اتنی بلندی پر ہے کہ ابھی تو وہ بھی اسے سمجھ نہیں سکتی!۔ میری بیوی ہر وقت جدید فیشن کے نئے لباس، نئے جوتے، نئی جیولری، نئے پردے، نئے قالین، نئی کار، نیا گھر...... یعنی ہر وقت بس نئے، نئے، کی رٹ لگائے رکھتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کبھی اس کے بس میں ہوا تو یہ نیا شوہر بھی لے لی گی۔ دراصل اسے پرانی اشیاء سے الرجی ہے اور گھر کی پرانی اشیاء بیچنے کے شوق میں وہ میری نادر کتابیں بھی بیچ چکی ہے بلکہ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وہ اپنا پرانا شوہر بھی نہ بیچ دے۔ نجانے وہ کیوں سمجھتی ہے کہ شادی کے دن مولوی نے اسے میرے نکاح میں نہیں بلکہ مجھے اس کی غلامی میں دیا تھا یا اس کے والد مجھے کسی بردہ فروش سے خرید کر لائے تھے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر اخراجات سے کم آمدنی والا مستحق کہلاتا ہے تو خاندان کو تمام زکوۃ اور صدقات بھی اسے دے دینے چاہئیں۔ میری بیوی کو اللہ تعالیٰ کے رزاق ہونے پر اتنا یقین ہے کہ اگر اس کا بس چلے تو زندگی بھر کی بچت شام سے پہلے شاپنگ میں اڑا ڈالے۔ اس کے فلسفۂ حیات کے مطابق شاپنگ بھی مذہب کے بنیادی ارکان کی طرح ایک اہم فریضہ ہے اور وہ یونہی بازاروں میں دھکے نہیں کھاتی پھرتی، ضروری کام نمٹاتی ہے۔ گھر کے لاکھوں روپے ماہانہ بجٹ کے باوجود یہ ایک پانچ سو روپے مہینے والی کمیٹی کا حصہ ہے اور اس کمیٹی کی منتظم خاتون کو یہ بھی علم ہے کہ ہمارے گھرانے کے کس فرد کے پاسپورٹ میں کس کس ملک کا ویزہ لگا ہوا ہے! اگر میں کبھی اسے کفایت شعاری کا مشورہ دوں تو اس کا ردِّعمل ایسا ہوتا ہے جیسے میں اُس کو اس کے والد کے ترکے کی رقم خرچ کرنے سے منع کر رہا ہوں حالانکہ وہ بہشتی ورثے میں صرف میرے چھ سالے اور سالیاں چھوڑ کر گیا تھا۔''

اس مرحلے پر ایک دوست چلائے: ''ارے! یہ تو میرے گھر کا قصہ سنا رہے ہیں۔ دیکھئے صاحب! خبردار! اگر آپ نے میری بیوی کے بارے میں ایک بھی مزید لفظ منہ سے نکالا۔''

ڈاکٹر صاحبؒ رندھی ہوئی آواز کے ساتھ: ''آپ حلف لے لیں، میں اپنی داستانِ غم سنا رہا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی بیماریوں کا علاج کرتا ہوں پھر پتہ نہیں یہ لاعلاج مرض میرے گلے کا طوق کیوں بن گیا ہے۔ میری دعا ہے کہ اگر مجھے جہنم بھی ملے تو میری ایک آدھ ہی سہی، نیکی کے صلے میں یہ ہو تو وہاں ہی لیکن مجھے دکھائی نہ دے۔ یقین جانیں میں سال میں کم از کم چار بار اس کی منت کرتا ہوں کہ میری جان چھوڑ دے لیکن اسے مجھ پر رحم نہیں آتا۔ ہاں جب مجھے خود اپنے آپ پر ترس آتا ہے تو خودکشی کے نتائج و عواقب پر غور شروع کر دیتا ہوں۔ میں اسے کیوں نہیں چھوڑ دیتا؟ میں اب بھی اپنی ماں کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔''

اب ہرکولیس کی تمام زنجیریں ٹوٹ چکی تھیں، مولا شہباز کو دعوتِ مبارزت دے رہا تھا! اور بیویوں سے نالاں حضرات بڑے زور شور سے ڈاکٹر کے حق میں نعرہ زن تھے۔ اگر آپ نے کسی محفلِ ناؤ نوش کا عروج دیکھا ہے تو آپ کو علم ہوگا کہ وہاں اس مرحلے پر صرف ہرکولیس ہی نہیں، بہت سے رستم و سہراب بھی میدان میں موجود ہوتے ہیں۔ اگر سننے والے کان بند ہو جائیں اور بولنے والی زبانیں میزائل کی طرح چھٹنے لگیں تو اس منظر کیلئے مچھلی مارکیٹ کے الفاظ بھی صورتحال کی عکاسی کیلئے موزوں نہیں رہتے۔

ایسے ہی ایک رستم عورتوں کی حمایت میں گرجنے لگے: ''دیکھئے ڈاکٹر صاحب! آپ کی تشریف آوری سر آنکھوں پر لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اسرائیل بن کر عورتوں کو فلسطین سمجھنا

شروع کردیں۔ ذرا شوہروں کے فضائل بھی تو بیان کریں۔ اس کمرے میں موجود آدھے شوہروں کی دوست خواتین کو تو میں بھی جانتا ہوں۔ اب اگر کسی بیوی کو اس طرح کا کوئی الزام چھو بھی جائے تو وہ زندہ نہیں بچ سکتی۔''

ایک اور حقوق نسواں کے علم بردار پکارے: ''بھائی جان اگر آپ زیادہ پریشان ہیں تو کسی اچھے سے حکیم سے مشورہ کیوں نہیں کرتے۔''

اب بادہ خواری، اصل خواری میں تبدیل ہو رہی تھی۔ صولت رفیع بولے: ''یہاں وہ لوگ بھی موجود ہیں جن کو دیگر تمام مقامات کے در بند ہونے کے بعد گھر کا دروازہ یاد آتا ہے۔ یہ شار کو ہی دیکھ لیں۔ بیوی کے لئے چپل اور محبوباؤں کے لئے جیولری کے تحفے خریدتا ہے۔''

ایک اور آواز: ''بھئی چپل سے پٹنا جو ہوتا ہے، اس لئے ہلکے وزن والا ہتھیار ڈھونڈنا اقوام متحدہ کے چارٹر اور آئین پاکستان کے تحت اس کا بنیادی حق ہے۔''

اس پر شار طیش میں آگیا اور گرجا ''ارے جورو کے غلام! تو کیا میرا برادر زن ہے کہ اپنی بہن کی اتنی حمایت کر رہا ہے۔''

صولت رفیع (جو ڈاکٹر سے بھی زیادہ اُس دختِ رز سے بغل گیر تھا جس کو دنیا سر پر اٹھانے کا طعنہ دیا جاتا ہے): ''دیکھو اگر میں نے اس سے کوئی دوسرا رشتہ جوڑ دیا تو ڈوب مروگے اور میں تمہارا سالا نہیں، تمہارا شناختی کارڈ والا والد میرا سالا تھا۔''

ایک آواز: ''توبہ! یہ تو بہن بھائی کی اولاد کا چکر نکل آیا!''

ایک اور آواز: ''آرڈر، آرڈر، سالا غیر پارلیمانی لفظ ہے اس لئے اسے اس معزز ایوان کی کارروائی سے حذف کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔''

ایک اور تبصرہ: ''شراب کی مہذب محفل کو کسی اسمبلی سے تشبیہ دینے والا رانی خاں کا سالا یہاں کہاں سے آن ٹپکا۔''

مزید تبصرہ: ''یہ کھلم کھلا اس ایوان کی توہین کا کیس ہے۔ سب سالوں کو باہر نکال دیا جائے۔''

ایک اور صدا: ''یہ اسمبلی نہیں، دربار شاہی ہے۔ تمام گستاخ زبانیں کاٹ دی جائیں اور شرپسندوں کا زن بچہ کولہو میں پلوادیا جائے۔ تعمیل ہو!''

اس پر ایک ہنگامہ بپا ہوگیا جسے ہوٹل سکیورٹی کی حدود آرڈیننس کی متوقع کارروائی کی دھمکی ہی ختم کرواسکی! اس بک بک کے اختتام پر کچھ لوگ ڈاکٹر صاحب کو ان کے کمرے تک چھوڑنے گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا گیا لیکن کھلا نہیں ''بیگم شاید سوگئی ہیں۔ آپ لوگ جائیں'' انہوں نے دونوں ہاتھوں سے دیوار تھامتے ہوئے کہا، کوئی دس منٹ بعد دروازہ کھلا اور یہ کمرے میں داخل ہوئے۔ پھر توپ کا گولہ چلنے کے انداز میں دروازہ بند ہوگیا......

عشائیے کا وقت ہوا۔ دوست کوئی پندرہ منٹ تک انہیں کھانے کے لئے فون کرتے رہے تو ان کی آمد ہوئی۔ مزید دو گھنٹے بعد پھر کوئی ان کے کمرے کے قریب سے گزرا تو یہ برآمدے میں ٹہل رہے تھے یا لڑھک رہے تھے یعنی دروازہ پھر بند!

دوسرے دن صبح لوگوں نے ان کی خیریت دریافت کرنا چاہی تو پتہ چلا کہ وہ تو علی الصبح چیک آؤٹ کر گئے تھے، یعنی گھر والی سے بقیہ لڑائی اس کے پسندیدہ محاذ یعنی گھر پر ہوگی۔ مزید تفتیش پر پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب رہنے والے تو اسلام آباد کے تھے لیکن ہوٹل کے ٹیکسی والے سے بہاولپور کا کرایہ طے کر رہے تھے کہ وہاں ان کے سسرال رہتے ہیں یعنی بیگم نہ صرف ان سے بھی پہلے ڈرائیور کے ساتھ جا چکی تھیں، بلکہ اب انہیں درپیش سفر بھی طویل تھا۔

اُٹھانا خود ہی پڑتا ہے تھکا ٹوٹا بدن اپنا
کہ جب تک سانس چلتی ہے کوئی کاندھا نہیں دیتا

پس نوشت: ہم نے یہ مضمون اپنے دفتر میں ٹائپ کے لئے دیا۔ کچھ دیر بعد ٹائپ کرنے والے ساتھی مسودہ لے کر آئے اور کہنے لگے ''سر! میں نے ایک بات پوچھنی ہے اگر اجازت دیں تو بیٹھ جاؤں۔'' ہمارے اثبات پر نشست سنبھال کر بولے: ''سر! میری شادی کو پچیس سال ہوگئے ہیں، بیوی کی خاطر بہن بھائی، دوست احباب سب سے کنارہ کش ہو چکا ہوں لیکن پھر بھی اس کے مزاج کا نقشہ بگڑا ہی رہتا ہے۔ یہ ''شوہر'' اتنا مظلوم کیوں ہے؟'' ہم نے جواب دیا کہ بھائی اس کا جواب تو اس دنیا کے پہلے شوہر سے ہی مل سکتا ہے جسے بعض روایات کے مطابق اس کی بیوی نے جنت سے نکلوا دیا تھا لیکن ان سے ملاقات تو اب روزِ قیامت ہوگی اور کیا پتہ وہاں بھی اماں حوا کے سامنے وہ کچھ کہہ سکیں گے یا نہیں! یا پھر اس دنیا کا پہلا قاتل قابیل بتا سکے کہ اُس بیوی کے ساتھ اس کا تجربہ کیسا رہا تھا جسے اس نے اپنے بھائی کو قتل کرنے کے بعد حاصل کیا تھا۔ ویسے یہ بات مستند ہے کہ جنت میں حور و غلمان کا وعدہ ہے، بیوی کا کوئی تذکرہ نہیں!

پیرس اوئے پیرس

احمد سعید/پرتگال

بڑے بھائی کے گھر سے ٹرین سیدھی ایفل ٹاور جاتی ہے جسے یہ توغ ایفل کہتے ہیں اور معذرت ٹرین بالکل سیدھی نہیں تھوڑا بہت بل بھی کھاتی ہے۔ ایک اور بات کہ بھائی کے گھر سے نہیں تھوڑا اُن کے گھر سے باہر نکل کر۔

بھائی کا پیرس میں ہونا ساس کے ہونے سے کم نہ تھا اور میری حیثیت اُن کے سامنے پرانی بہوؤں کی سی تھی۔ جس پر ہر پل انہوں نے نظر رکھی ہوئی تھی ہر دو گھنٹے بعد فون آجاتا کہ کہاں ہیں؟ کب آنا ہے؟

میں نے کہا جی کہ توغ ایفل (ایفل ٹاور) آ کر کوئی غلطی ہوگئی۔ جتنا بڑا ہے یہ کیا ڈانٹنے لگ جاتا ہے اگر زیادہ دیر یہاں گزاریں تو۔ لیکن ایفل ٹاور کا جیسے سنا تھا ویسا ہی نکلا۔ واقعی دنیا کا ایک عجوبہ تھا۔ بہت ہی لمبا ہے۔ سنا ہے کہ لمبوں کی عقل گھٹنوں میں ہوتی ہے۔ جتنا یہ لمبا ہے اس کے پاس تو عقل نام کی کوئی شے نہ ہوگی۔

اس کے اوپر جانے کی خواہش اس لیے نہ کی کہ ٹکٹ لینے کے لیے سینکڑوں لوگوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ اپنا تو حوصلہ نہ پڑا۔ ہم نے جہاز سے اُترتے ہوئے سارا پیرس دیکھ لیا تھا۔ ایفل ٹاور کے اوپر سے بھی ویسا ہی نظر آتا تھا۔ وہاں ایک عجب بات دیکھی۔ ایفل ٹاور کے سامنے لموزین گاڑیاں آتی تھیں۔ اُس میں کوئی دس کے قریب لڑکیاں اُترتیں اور ایک آدھا لڑکا۔ عجیب لموزین کا آنا نہیں تھا۔ یہ جو ایک آدھ لڑکے کے ساتھ دس دس حسیناؤں کا جھنڈ تھا۔ اس کا کچھ سمجھ آیا کچھ نہیں۔

فرانس انتہائی جدید قوم ہے لیکن آم ابھی بھی پاکستان سے ہی آتے ہیں۔ فرانس کے دوسرے شہروں سے بھی لوگ پیرس میں آم خریدنے آتے ہیں۔ انہیں اکثر دوکاندار کہہ بھی دیتے ہیں کہ (''ایتھے امب لین آیاں'') وہ آگے سے مسکرا کے جی جی کہہ دیتے ہوں گے۔ جی جی کو یہاں سی سی کہتے ہیں۔ اس قسم کا ملتا جلتا لفظ پاکستان میں بھی بہت کارآمد ہے یعنی ٹی سی۔ بس ٹی سی کرتے جائیں کام نہ کریں۔ پر یہاں ٹی سی نہیں چلتی۔ ہاں البتہ ٹیکسیاں بہت چلتی ہیں۔ بہت پیاری پیاری ٹیکسیاں چلتی ہیں۔ یعنی مرسڈیز وغیرہ بطور ٹیکسیاں ہی چلتی ہیں۔ فرانس میں غلط فرنچ بولنا صحیح انگلش بولنے سے بہت بہتر ہے۔ انگلش بولیں گے تو پھر یہ آپ سے نہیں بولیں گے۔ ''ٹھُکی'' ہوسکتی ہے ہلکہ ہو کیا سکتی ہے ہو جائے گی۔ لیکن اب کہیں نہ کہیں صرف ایڈریس پوچھنے کیلئے چل جاتی ہے۔ اکثر فرنچ ایسے ملیں گے جنھیں انگلش بھی آتی ہوگی آپ کی بات بھی سمجھ لیں گے پر جواب فرنچ میں ہی دیں گے یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ کو فرنچ نہیں آتی۔ کیونکہ فرنچوں کا کہنا ہے کہ اگر آپ کو فرنچ نہیں آتی تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ پیرس شہر دیکھ کر محسوس ہوا کہ پیرس پیرس ہے پر پیرس جتنا بھی خوبصورت ہو ''لاہور لاہور اے''

فرنچ لمبے اور بہت سمارٹ ہوتے ہیں۔ اتنے سمارٹ کہ پاکستان میں ہوں تو ہر شخص گزرتا ہوا کہے کہ جناب کچھ کھا بھی لیا کریں۔ لیکن بہت فریش اور ایکٹو ہوتے ہیں۔ بات سیدھی کرتے ہیں اکثر بدتمیزی کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں لیکن سب ایسے نہیں ہیں۔

ٹرین سسٹم میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ دنیا کی سب سے تیز ترین ٹرین ''تے جے وے'' انہی کی ایجاد ہے۔ بغیر ڈرائیور کے ٹرین بھی انہی کی ایجاد ہے۔ دنیا کی سب سے فضول ترین ایجادیں بھی یہیں ملتی ہیں جیسے کہ فرنچ کٹ اور فرنچ ''کس'' وغیرہ۔ ٹائم کے بہت پابند ہیں۔ یورپ کے دوسرے ملکوں سے بھی زیادہ۔ میں اور میری بیگم صاحبہ جب بارسلونا سے پیرس فرنچ ٹرین ''تے جے وے'' پہ آئے تو پیرس پہنچنے سے کچھ لمحات پہلے بار بار کوئی اناؤنسمنٹ ہو۔ مجھے شک گزرا کہ ٹرین میں کوئی بڑی فلمی شخصیت نہ گھس گئی ہو۔ ذہن میں کبھی انجلینا جولی اور کبھی نکول کڈمین۔ یہاں تک کہ وینا ملک کی طرف بھی ذہن چلا گیا۔ پھر خیال آیا کہ تے جے وے تین سو پچاس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ یہ کیسے

آ سکتی ہیں۔ دل پھر بھی کہے کہ آ گئیں ہیں جیسے بھی آئی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ سپائیڈر مین کے توسط سے آئی ہوں۔ اس معرکے کے بانی وہ ہی ہوں گے۔

کس احمق کی خواہش تھی کہ سپائیڈر مین کو دیکھے۔ میں تو Nicole کی آنکھوں اور انجلینا کی اداؤں کے تعاقب میں تھا۔ فوری طور پر ایک لڑکی سے دریافت کیا کہ بار بار یہ کیا اعلان ہو رہا ہے؟ فرمانے لگیں کہ ٹرین تین منٹ دیر سے پیرس پہنچ رہی ہے۔ میں سر پکڑ کے بیٹھ گیا کہ یہ ٹائم کے پابند ہی نہیں تھوڑے کھسکے ہوئے بھی ہیں۔ ٹرین رکی تو انوسنٹ ابھی بھی جاری تھی۔ دل نے کہا کہ کوئی نہ کوئی آ گئی ہے اور نہیں تو میرا ہی آئی ہوگی۔ ان میں سے تو کوئی نہ آیا البتہ بڑے بھائی ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ انہیں وہاں رہتے ہوئے دس سال ہوگئے تھے۔ کہنے لگے ٹرین تین منٹ لیٹ پہنچی۔ غصہ مجھے پہلے ہی بہت تھا کسی ایکٹرس کے نہ آنے پر۔ بھائی کی بات سنتے ہی میں بولا کہ فرنچ ٹی وی چینلز پہ آپ نے سنا ہوگا۔ اب تھوڑی دیر تک CNN اور BBC پہ بھی یہ خبر چلنی ہوگی۔ بھائی میرا منہ دیکھیں۔ میں پیرس دیکھوں۔ جی دیکھنے جو پیرس آئے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کا منہ تھوڑی۔

فرانس جانے سے پہلے میں فیصل آباد ایگریکلچر یونیورسٹی سے فرنچ کورس کرکے نکلا تھا اور یہاں آ کے کئی فرنچیوں کے دانت کھٹے کر چکا تھا۔ ایک جگہ دو فرنچ لڑکیوں کے ساتھ ایسی فرنچ بولی کہ اُن کے دانت ہی اندر نہ جائیں۔ وہ ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ، حالانکہ میں نے فرنچ میں کوئی لطیفہ نہیں سنایا تھا۔ اب تین چار ماہ کے فرنچ کورس سے اتنی ہی فرنچ آنی تھی۔ جیسے کسی ''ٹھیٹ'' پنجابی بولنے والے نے نئی نئی اُردو بولنی شروع کی ہو۔ وہ ہنستی جائیں اور معذرت کرتی جائیں۔ معذرت کی کیا ضرورت؟ میں تو چاہتا تھا کہ ہنستی جائیں۔ آپ نے وہ محاورہ تو سنا ہوگا کہ

''ہسی تے پھسی''

لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ آپس میں پہلے سے ہی پھنسی ہوں۔ یہ یورپ تھا اوپر سے فرانس کا شہر پیرس، یورپ کا بھی باپ۔ یہاں سب کچھ ہوسکتا ہے۔ جہاں بے غیرتی عام ہو وہاں سب کچھ ہی ہوسکتا ہے۔ ہنسی ابھی بھی متواتر جاری تھی کیونکہ میری فرنچ اُن پہ طاری تھی۔ میں اپنی جارحانہ فرنچ مسلسل جاری رکھے ہوئے تھا۔ جس سے ایک لڑکی سے تو سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے پیٹ کو تھاما ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے مجھے مسلسل اشارے کر رہی تھی کہ بس کردو۔

میں بھی فیصل آباد سے آیا ہوا تھا۔ موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے فرنچ اور تیز کر دی۔ اب میری فرنچ، فرنچ ٹرین ''تے جے وے'' کے مقابل جا رہی تھی یعنی تین سو پچاس کلومیٹر فی گھنٹہ۔ اس سے آدھی سپیڈ پر بھی شعیب اختر نے کبھی گیند نہ پھینکی ہوگی۔ جتنی تیز میں فرنچ پھینک رہا تھا ۔ ویسے وہ بھی بہت دل پھینک لگ رہی تھیں اور میں اُس لمحے تھنک ٹینک۔

برطانیہ میں مقیم ممتاز شاعرہ
ناول نگار، کالم نگار، افسانہ نویس
ریڈیو کمپیئر اور ٹی وی اینکر
سعدیہ سیٹھی کی کتب
① کبھی ناراض مت ہونا (شعری مجموعہ)
② پہلیاں (شعری مجموعہ)
③ محبت آخری سچ ہے (ناول)
④ مشرق کی خوشبو (افسانے)
⑤ پہلیاں (انتخاب)
نستعلیق مطبوعات
الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

لاہور میں مقیم معروف شاعر
شاہد ایم بیگ کے شعری مجموعے
میری فکر، میرا جہاں
میزانِ خرد و جنوں
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگئے ہیں
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

افسانہ

باپ

کیتھرین لم، سنگاپور/عطا صدیقی

بچے ہمیشہ خوف اور شوق کی ملی جلی کیفیت میں باپ کے گھر لوٹنے کی راہ دیکھا کرتے۔ خوف ہوتا اس مخمور گھونسے کے منہ پر پڑنے کا جس سے خون بہہ نکلا تھا اور ہونٹ دنوں تک سوجے رہتے تھے اور شوق ہوتا اس کھانے کا جو باپ بعض اوقات اپنے ساتھ لے کر آتا تھا یعنی بڑے بڑے پڑوں میں انڈوں اور ترکاریوں کے ساتھ تلے ہوئے گرما گرم نوڈلز۔ اصل میں باپ یہ پکوان لاتا تو تھا اپنے کھانے کے لیے، لیکن وہ عموماً اتنا زیادہ مال لے آتا تھا کہ وہ خود بھی اس کو ختم نہیں کر پاتا اور پھر پس خوردہ مال کے لیے بچوں کی لٹس مچی تھی جس کی گھات میں وہ میز کے آس پاس مستعد موجود ہوتے۔ جو ماں مداخلت نہ کرتی کہ سب کو برابر برابر مل جائے چاہے وہ اس تر مال کا ایک لقمہ ہی ہو تو سب سے بڑے اور توانا بچے سب کچھ جھپٹ لیتے اور چھوٹوں کے لیے ایک ریزہ نہ چھوڑتے۔

وہ چھ عدد بچے تھے۔ دو سب سے بڑوں میں ایک بارہ برس کا لڑکا اور دوسری گیارہ سال کی لڑکی تھی۔ وہ دونوں چھریرے ہونے کے باوجود نڈر اور جاندار تھے اور جب کبھی چھوٹوں کو بھی کچھ نہ کچھ حصہ دلوانے کے لیے ماں وہاں موجود نہ ہوتی تو وہ سب کچھ آپس میں بانٹ کھاتے۔ نو برس کے دو جڑواں لڑکے تھے، آٹھ سال کی ایک منحنی سی لڑکی تھی اور پھر ایک پاؤں پاؤں چلتا دو برس کا ننھا جو دوسروں کی طرح مال غنیمت میں سے اپنا جائز حق حاصل کرنے کے لیے مچلتا۔

بچے اس ایک آدھ بار کو یاد کر سکتے تھے۔ جب ان کے باپ نے اپنی فیاضی سے انہیں حیرت میں ڈال دیا تھا۔ وہ واقعی ان ہی کی خاطر تر مال کے دو بھرے ہوئے پڑے لے کر آیا تھا جن کو مل جل کر کھاتے ہوئے وہ اتنے نہالوں نہال ہو گئے تھے کہ وہ اس کو جلدی جلدی ہڑپ نہیں کر سکے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے ساتھ بیٹھ کر ٹونگتے ہوئے ماں بھی کھلی جا رہی تھی۔

لیکن مسرت کی وہ گھڑی پھر کبھی نہ آئی۔ اب باپ کبھی بھی کھانے کو کچھ نہ لاتا۔ اب تو بچے اپنے آپ اس وقت کو خوش بخت سمجھتے تھے جب باپ وحشت حالت میں نہ آتا اور جب ان کی اور ان کی ماں کی ٹھکائی نہ کرتا۔ آس ان کو پھر بھی لگی رہتی اور اگر وہ اس وقت جاگ رہے ہوتے جب ان کا باپ رات گئے گھر آتا تو وہ اپنے دیدے پھاڑ پھاڑ کر یہ معلوم کرنا چاہتے کہ دھاگے سے لپٹا کوئی خاکی کپڑا تو اس کی انگلیوں میں نہیں لٹک رہا۔ اگر وہ دندناتا، پیر پٹختا آتا تو صاف ظاہر تھا کہ کھانے کو کچھ نہیں لایا، تب بچے اس خوف سے ایک دوسرے سے لپٹ کر دبک جاتے تھے کہ ان کی ذرا سی بھی آواز اس کو برہم کر دے گی اور اس کے بڑے ہاتھ کو ان کے چہروں کی طرف لپکنے کی دعوت دے گی۔

ان کی ماں کا منہ اکثر ٹوٹتا رہتا تھا۔ ایسی راتوں میں بچوں نے بارہا اس کو روتے بسورتے سنا تھا۔ اگلی صبح اس کے گال اور آنکھیں اس قدر سوجی ہوتیں کہ قریب کی اونچی حویلیوں میں کپڑے دھونے جانے میں اسے شرم آتی۔ جن راتوں میں باپ معمول سے زیادہ دیر میں اور معمول سے زیادہ بے سدھ حالت میں لوٹتا تو بچے اتنے سیانے تھے کہ وہ موئی موئی کو اس کی نظروں سے دور رکھتے۔ یہ اس لیے کہ آٹھ سالہ موئی موئی جو سدا کی روگی تھی اور ہر وقت بلونگڑے کی طرح روتی بلکتی رہتی تھی باپ کو بھڑکا دینے کا ایک سبب تھی۔ اس کی ناک ہمہ وقت بہتی رہتی تھی، منہ نرالی طرح پھڑکتا، ٹانگیں پھنسیوں سے پھلی رہتیں جن کو وہ دل لگا کر کھجاتی رہتی اور یوں گلابی رستے زخم بہتے رہتے۔ حالانکہ ماں بار بار اس کو ایسا کرنے سے منع کرتی۔ مگر سب سے زیادہ بے زار کر دینے والی اس کی ریں ریں تھی۔ ایک کونے میں اسٹول پر گھٹی سمٹائی یا دوسرے بچوں کے ساتھ چٹائی پر لیٹی لیٹی وہ اپنی پتلی پتلی آواز میں گھنٹوں روتی رہتی۔ بڑا لڑکا اور لڑکی اس کی اس حرکت سے الجھتے تھے اور چیخ کر ماں سے شکایت کرتے تھے جو تھکی تھکی آواز میں بچی کو ڈانٹ دیتی تھی، لیکن جن راتوں میں

باپ گھر میں ہوتا اور اپنے ادھے پوے لیے بیٹھا ہوتا تو وہ زیادہ دھیان رکھتے کہ موئی موئی ذرا بھی نہ جھکے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس کا بسورنا باپ کے اعصاب پر اتنا زیادہ ناگوار اثر ڈالتا تھا کہ وہ پوری شدت سے گڑگڑاتا اور رونا اس کے بعد بھی جاری رہتا تو وہ چل کر بچی تک جاتا اور اسے بری طرح پیٹ ڈالتا اور پھر وہ دوسرے بچوں کی طرف متوجہ ہوتا اور ان کو بھی دھن ڈالتا۔ گویا وہ اپنی اس بدبختی کا مجموعی طور پر ان سب کو ذمہ دار سمجھتا تھا۔

اس رات باپ اپنے انتہائی غضبناک موڈ میں گھر آیا تھا۔ کیونکہ اس کو لکڑی چیرنے کے کارخانے سے نکال دیا گیا تھا۔ اس وقت موئی موئی لمبی سسکیاں لے کر روئے جا رہی تھی اور دونوں بڑے بھائی بہن بھی اس کو چپ نہیں کرا پائے تھے۔ حالانکہ انہوں نے اسے ڈانٹا، مارا بھی تھا۔ اگلے پل بغیر کچھ کہے سنے باپ کا گھونسا اس کی ننھی پھولی تھوتھنی پر پڑا اور لڑکی تیورا کر کمرے کے دوسری طرف اُلٹ گئی اور بے سدھ پڑ گئی۔ آفت کو بھانپتے ہوئے دوسرے بچے جلدی جلدی گھر سے نکل بھاگے اور ماں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار مار کر بچی کو ہوش میں لائی۔

مگر دو دن بعد ہی موئی موئی مرگئی اور جب ایک کلومیٹر دور تلینیھی میں واقع دیہی قبرستان میں دفنانے کے لیے اس کی میت اُٹھائی گئی تو رونے والوں میں صرف اس کی ماں ہی تھی۔ پھر روگی بچی کو یاد کرتے ہوئے کچھ گرائیں تعزیت کرنے آ گئے۔ باپ کے لیے جو منہ لپیٹے دلگیر بیٹھا تھا یہ جانتے ہوئے کہ وہ بے کار بھی ہے ان کی ہمدردیاں دہری تھیں۔ ایک رحم دل عورت نے کچھ چندہ جمع کیا اور دل جوئی کے طور پر باپ کو پیش کر دیا۔ جس پر وہ شخص جسے خود اپنی حالت پر ترس آ رہا تھا، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی اس بپتا کی خبر جلد ہی اس کے مالک کو مل گئی جو کہ ایک سخت گیر مگر ہمدرد آدمی تھا۔ اس نے اس کے بیوی بچوں کی خاطر اس کو دوبارہ ملازمت دینے کا فیصلہ کیا اور دل کا بڑا ہونے کی وجہ سے وہ خود پرسا دینے آیا اور ساتھ ہی اس کی مدد کے لیے کچھ رقم بھی لایا (جو اس نے احتیاطاً اس شخص کو دینے کی بجائے اس کی بیوی کو دے دی)۔ اپنے پرانے آجر کو وہاں دیکھ کر اور اپنی مردہ بیٹی کے لیے اس کی ہمدردی کے بول سن کر وہ شخص زار و قطار رونے لگا اور اسے چپ کرانے کے لیے پھر سے دلاسا دینا پڑا۔

اس کی خودرحمی اب اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس نے خود کو ایک مصیبت کے مارے باپ کے رُوپ میں دیکھا جو اپنی لختِ جگر کی بے محل موت کا ماتم کر رہا ہو۔ اس خودرحمی کے ساتھ ہی مری ہوئی بچی کے لیے سچے پیار کا سوتا پھوٹ نکلا اور وہ المناک انداز میں بار بار بین کرنے لگا۔ ''ہائے غریب موئی موئی، ہائے میری دکھیاری بیٹی'' وہ اس کو اپنی تلینیھی میں بنی قبر میں لیٹی نظر آئی۔ دبلی، پتلی، چپٹی اور دھان پان اور غم اور رحم کی لہروں نے اس کے گندمی بڑے بڑے شانوں اور بازوؤں کو یوں ہلا کر رکھ دیا کہ دیکھنے والے بھی سہم گئے۔ پڑوسیوں نے اس کی ڈھارس بندھانے میں اپنی ہر ممکن کوشش کی اور چند ایک اپنی ڈبڈبائی آنکھیں لیے وہاں سے یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ وہ بھلے ہی لاپرواہ اور بلانوش ہو پر اسے اپنی بیٹی سے سچا پیار تھا۔

غم کے مارے ہوئے باپ نے جلد ہی اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کو ایک خیال آیا۔ آج کے بعد سے وہ ایک بہت اچھا باپ بن جائے گا۔ اس نے اپنی جیب سے وہ رقم نکالی جو اس کے سیٹھ نے اس کی بیوی کو دی تھی (اور جو اس کی بیوی نے فوراً ہی اس کی جان کر اس کے حوالے کر دی تھی) اس نے نوٹوں کو گنا۔ وہ ان میں سے ایک بھی دارو پر خرچ نہیں کرے گا۔ نہیں اب کبھی نہیں۔ وہ اٹھا اور فیصلہ کن انداز میں گھر سے باہر نکل گیا۔ بچوں نے اسے دیکھا اور تعجب کیا کہ وہ کہاں گیا ہوگا۔ ان کی نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا۔ وہ بستی کی طرف جا رہا تھا۔ ان کے منہ لٹک گئے۔ کیونکہ ان کو یقین ہو گیا کہ وہ اپنی بوتلیں لے کر ہی لوٹے گا۔

باپ ایک گھنٹہ بعد لوٹ آیا۔ وہ ایک بڑا سا کاغذی تھیلا اُٹھائے ہوئے تھا جو کہ چھوٹے چھوٹے کاغذی پڑوں سے ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تھا۔ اس نے وہ لا کر میز پر رکھ دیا۔ بچوں کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ مگر کیا وہ چاکلیٹ کا ڈبہ ہے؟ انہوں نے اپنے دیدوں کو اور پھاڑا۔ ایک تو انگور کی تھیلی تھی، ایک ایسا ڈبہ تھا جو بظاہر بسکٹ کا معلوم ہوتا تھا۔ بچے آپس میں اس کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ بڑے نے کہا یہ بسکٹ ہونا چاہیے۔ اس نے ایسے کئی ڈبے بستی میں ہو چیک کی دکان پر دیکھے ہیں اور بڑی لڑکی کا پر زور اصرار تھا

کہ وہ مٹھائی ہوگی۔ اسی طرح کی جیسی ایک بار بڑی حویلی والی لوسو نے جہاں ماں کپڑے دھونے جاتی تھی ان کو دی تھی۔ جڑواں لڑکے ہر دو پر راضی تھے اور اس کی توقع میں فقط منہ پھاڑے مسکرا ہی سکتے تھے۔ وہ اسی طرح تکرار کرتے انگل لگاتے رہے۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ باپ کے اشارے کے بغیر خزانے کو ہاتھ لگائے۔ وہ باپ کے باہر آنے کے انتظار میں بے صبرے ہو چکے تھے۔

کپڑے بدل کر وہ جلد ہی باہر آیا اور میز کے پاس گیا لیکن وہ اشارہ کہ جس پر بچے اس مرغوب خزانے کو ہاتھ لگاتے کبھی نہ ہوا۔ بلکہ باپ نے وہ بڑا کاغذی تھیلا اُٹھا لیا اور دوبارہ گھر سے باہر نکل گیا۔ دونوں بڑوں نے اس کے سماعت سے دور جانے کا انتظار کیا اور اس خزانے سے دستبردار نہ ہونے کی خاطر جو تقریباً ان کی دسترس میں تھا سرگوشی میں ایک دوسرے سے کہا ''آؤ پیچھا کریں۔ دیکھیں وہ کہاں جارہے ہیں۔'' دونوں جڑواں لڑکوں نے بھی جانے پر ضد کی اور یوں چاروں محفوظ فاصلے پر پیچھے پیچھے چلے۔ عام حالات میں باپ نے ان کو دیکھ لیا ہوتا اور جھڑک کر گھر جانے کو کہا ہوتا لیکن اس وقت وہ اپنی دھن میں مگن تھا، اس نے ان کو دیکھا ہی نہیں۔

وہ تلیٹھی کے قبرستان پہنچ گیا اور جس قبر پر جا کر ٹھہرا وہ ابھی تازہ تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکا اور چیزیں کاغذی تھیلوں میں سے نکال نکال کر احتیاط سے قبر پر سجانے لگا اور روہانسی آواز میں کہتا گیا ''میری پیاری بیٹی! ان چیزوں کے سوا تمہارے باپ کے پاس تمہیں پیش کرنے کے لیے اور کچھ نہیں۔ اُمید ہے تم انہیں قبول کرلوگی۔'' پھر وہ تادیر اس سے باتیں کرتا رہا اور بچے قریب ہی جھاڑیوں میں چھپ کر یہ دیکھتے رہے۔ آسمان سیاہ ہو چکا تھا اور گھنے بادل کسی بھی لمحے برسنے کو تھے لیکن باپ تھا کہ دعائیں مانگے جارہا تھا اور روئے جارہا تھا۔ چھینٹا پڑ جانے پر بھی وہ دوزانو ہی رہا۔ پھر وہ اٹھ کر وہاں سے چل دیا۔ اس کی شرابور قمیص اس کے بدن سے چپکی ہوئی تھی۔ بچے جو بہت زیادہ بے تاب ہو چکے تھے اس خزانے پر ٹوٹ پڑے۔ بہت کچھ بارش نے برباد کردیا تھا لیکن جتنا کچھ بھی وہ بچا سکتے تھے انہوں نے جھپٹ لیا اور ایسی شاندار دعوت اُڑائی جیسی وہ جانتے تھے کہ پھر کبھی نہ مل سکے گی۔

حُسن اور حکومت سے کون جیتا سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

ممتاز شاعر، کالم نویس، مترجم اور
ماہنامہ ''ارژنگ'' کے مدیر اعلیٰ

عامر بن علی کی کتب کے

نئے ایڈیشن مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگئے ہیں

① چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
② سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
③ ''محبت چھوگئی دل کو'' (شعری مجموعہ)
④ گفتگو (انٹرویوز)
⑤ آج کا جاپان (کالم)
⑥ محبت کے رنگ (تراجم)

ناشر

نستعلیق مطبوعات

الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

ممتاز کالم نویس

رئیس عباس زیدی کی کتب

① شام وسحر کے درمیاں (آپ بیتی)
② سلسلۂ روز و شب (کالم)
③ قرآنی دُعائیں (انتخاب)

ناشر

نستعلیق مطبوعات

الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

ممتاز شاعرہ اور کالم نویس

ڈاکٹر صغرا صدف کے شعری مجموعے

''وعدہ''

کا تیسرا ایڈیشن نہایت خوبصورت
انداز میں شائع ہوگیا ہے

ناشر

نستعلیق مطبوعات

الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

افسانہ

مٹھی بھر کھجوریں

طیب صالح، سوڈان / احمد صغیر صدیقی

میں اس وقت یقیناً بہت چھوٹا رہا ہوں گا۔ مجھے یہ بات تو بالکل یاد نہیں کہ اس وقت میری عمر کیا تھی۔ تاہم یہ بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں جب اپنے دادا کے ساتھ باہر نکلتا تھا تو مجھے ملنے والے لوگ آ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے اور کچھ میری پیٹھ تھپتھپایا کرتے تھے اور یہ ایسی باتیں تھیں جو وہ میرے دادا کے ساتھ نہیں کرتے تھے۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کہ میں عموماً اپنے باپ کے ساتھ نہیں بلکہ دادا کے ساتھ باہر نکلا کرتا تھا۔ جب بھی وہ کہیں باہر جاتے تھے مجھے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ بس صبح کے وقت میں اکیلا جایا کرتا تھا۔ مسجد میں قرآن پڑھنے کے لیے۔ مسجد دریا اور کھیت ہماری زندگی میں یہی چیزیں سنگ میل کا درجہ رکھتی تھیں۔ میرے ساتھی بچے مسجد میں قرآن پڑھنے جانے سے عموماً جی چراتے تھے لیکن مجھے جانے میں مزہ آتا تھا۔ بلاشبہ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ شیخ مجھے پسند کرتے تھے۔ کیونکہ میرا حافظہ اچھا تھا اور میں سورتیں جلد یاد کر لیتا تھا۔ پھر جب مسجد میں کوئی اہم آدمی آتا تو شیخ مجھ سے کہتے تھے اور میں کھڑے ہو کر سورۃ فاتحہ کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ مسجد میں آنے والے لوگ شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے تھے، بالکل اس طرح جیسے اور لوگ میرا خیر مقدم کرتے تھے۔ جب میں دادا کے ساتھ گھر سے نکلتا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ مجھے مسجد سے لگاؤ تھا اور مجھے دریا سے بھی بڑی محبت تھی۔ قرآن کے سبق سے فارغ ہو کر میں سیدھا گھر بھاگتا تھا۔ وہاں اپنا بستہ اور تختی پھینکنے کے بعد میں جلدی جلدی ناشتہ کرتا تھا اور پھر ہرنوں کی طرح چوکڑی بھرتا ہوا دریا کی طرف نہانے کے لیے نکل جاتا تھا۔ جب میں تیراکی سے تھک جاتا تھا تو کنارے بیٹھ کر پانی کو دیکھتا رہتا تھا۔ مشرق کی سمت بہتے ہوئے جو آگے جا کر بہت سے درختوں کے درمیان چھپ گیا تھا۔ یہاں بیٹھ کر میں اکثر تصوراتی باتیں سوچا کرتا تھا۔ کبھی سوچتا تھا کہ ان درختوں کے پیچھے دیوزادوں کے قبیلے رہتے ہیں جن کے لوگ لانبے قد کے ہیں اور جن کی سپید سپید داڑھیاں ہیں اور نوکیلی ناکیں بھی۔ بالکل میرے دادا جیسی۔ میرے دادا کی عادت تھی کہ وہ کسی بھی سوال کا جواب دینے سے قبل اپنی ناک کو ضرور کھجاتے تھے یا پھر داڑھی میں انگلیاں پھیرتے تھے جو برف کی طرح سفید اور نرم تھی۔ اپنی پوری زندگی میں ایسی سفید داڑھی میں نے کسی اور کی نہیں دیکھی۔ میرے دادا کا قد بھی بہت لانبا تھا اور ان سے مخاطب ہونے والے کو اپنا سر اُٹھانا پڑتا تھا۔ اسی طرح وہ جب بھی کسی دروازے میں داخل ہوتے تھے تو انہیں اپنا سر ضرور جھکانا پڑتا تھا۔ دریا بالکل اسی انداز میں خمیدہ ہو کر درختوں کے جھنڈ کے پیچھے گیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے فوراً دادا کا دھیان آتا تھا۔ میں اپنے دادا کو بہت چاہتا تھا اور سوچا کرتا تھا جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو بالکل دادا کی طرح ہو جاؤں گا اور انہیں کی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا کروں گا۔

میرا خیال ہے کہ میں اپنے دادا کا سب سے چہیتا پوتا تھا۔ کیونکہ میں ذہین تھا جبکہ میرے عم زاد کند تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ دادا کب خاموشی پسند کرتے ہیں اور کب چاہتے ہیں کہ میں ہنسوں۔ میں ان کے نماز کے اوقات کو اچھی طرح یاد رکھتا تھا اور ٹھیک وقت پر ان کے لیے مصلیٰ لا کر بچھا دیا کرتا تھا۔ جب ان کے پاس خالی وقت ہوتا تھا تو وہ مجھ سے باتیں کیا کرتے تھے یا سورتیں سنا کرتے تھے اور میری آواز میں قرآن سُن کر وہ بہت خوش ہوتے تھے۔

ایک روز میں نے ان سے اپنے پڑوسی کے بارے میں پوچھا جس کا نام مسعود تھا۔ میں نے کہا ''دادا! لگتا ہے آپ مسعود کو پسند نہیں کرتے؟''

انہوں نے حسبِ عادت داڑھی کھجائی پھر کہا ''وہ ایک عیاش آدمی ہے اور میں ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔''

جواب میں دادا نے سر جھکا لیا۔ پھر سوچتے ہوئے بولے ''تم یہ وسیع و عریض کھیت دیکھ رہے ہو؟'' انہوں نے کھیتوں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا ''جو اس حد سے لے کر دریائے نیل کے

ساحل تک پھیلے ہوئے ہیں؟ کیا تم کھجوروں کے ان درختوں کو دیکھ رہے ہو؟ اور ان درختوں کو...... سنت کے، آ کاسیا کے اور سیال کے؟ یہ تمام کی تمام چیزیں مسعود کو ملی تھیں۔ اس کے باپ کے ترکے کے طور پر۔''

دادا کی لمحاتی خاموشی کا فائدہ اُٹھا کر میں نے اُدھر دیکھا تھا جدھر دادا نے اشارہ کیا تھا۔ پھر میں نے سوچا مجھے کیا یہ سب کس کے ہیں تو میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ کھجور کے درخت...... یہ ٹیڑھے میڑھے پیڑ...... یہ چٹختی ہوئی زمینیں...... میری خوابوں کی دنیا کی ہیں اور میں یہاں کھیلتا ہوں۔''

''ہاں بیٹے'' دادا نے پھر بولنا شروع کر دیا۔ ''چالیس سال قبل یہ تمام چیزیں مسعود کی تھیں...... مگر اب ان کا دو تہائی حصہ میرے پاس ہے۔''

یہ بات میرے لیے بالکل نئی تھی۔ میں تو سمجھتا تھا کہ یہ تمام اشیاء میرے دادا کے پاس اس وقت سے ہیں جب سے دنیا وجود میں آئی تھی۔

''جس وقت میں اس گاؤں میں وارد ہوا تھا میرے پاس ایک گز زمین بھی نہ تھی۔ یہ ساری دولت اس وقت مسعود کے پاس تھی۔ مگر اب صورت حال بدل چکی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خدا کے ہاں سے بلاوا آنے سے قبل میں شاید اس کی بقیہ چیزیں بھی اس سے خرید لوں گا۔''

نہ جانے کیوں دادا کی یہ باتیں سُن کر مجھے کچھ خوف سا محسوس ہوا تھا اور اپنے ہمسائے پر ترس بھی آیا تھا۔ میرا جی چاہا تھا کہ کاش دادا اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکیں۔ پھر مجھے مسعود کی آواز کا خیال آیا تھا جو بہت مدھر اور میٹھی تھی اور جب ہنستا تھا تو لگتا تھا جیسے قریب کوئی چشمہ گنگناتا ہوا بہہ رہا ہو۔ جبکہ میرے دادا کبھی نہیں ہنستے تھے۔

میں نے دادا سے پوچھا ''آخر مسعود نے اپنی زمینیں بیچ کیوں دیں؟''

''عورتیں'' میرے دادا نے کہا۔ انہوں نے ''عورتیں'' کا لفظ اس طرح ادا کیا جیسے یہ کوئی خوفناک چیز رہی ہوں۔

''یہ مسعود جو ہے نا؟ میرے بچے، اس نے بہت سی شادیاں کی ہیں۔ ہر نئی شادی پر یہ اپنی کچھ زمین میرے ہاتھ بیچتا رہا ہے۔'' وہ اس طرح کہہ رہے تھے جیسے مسعود نے کوئی نوے شادیاں کر رکھی ہوں۔ مجھے یاد آیا کہ اس کی تین بیویاں ہیں، مجھے اس کا سراپا بھی یاد آیا جو بہت بھدا سا تھا۔ اس کا گدھا بھی لنگڑا تھا اور اس کی کاٹھی بھی پرانی اور شکستہ ہی نظر آیا کرتی تھی۔ میں ان خیالات سے گزر رہا تھا کہ ہمیں مسعود اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ دادا نے مجھے اور میں نے دادا کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''ہم آج پیڑوں سے کھجوریں اتار رہے ہیں۔ کیا آپ لوگ چلنا پسند کریں گے؟''

مجھے نہ جانے کیوں اندازہ ہوا کہ وہ یہ بات نکلنا کہہ رہا ہے دل سے نہیں چاہتا کہ دادا اُدھر جائیں۔ مگر دادا نے یہ موقع نہیں چھوڑا اور فوراً تیار ہو گئے۔ بلکہ میں نے محسوس کیا جیسے ان کی آنکھیں چمک اُٹھی ہیں۔ دادا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم لوگ مسعود کے ساتھ چل دیے۔

پھر وہ کوئی ایک اسٹول اُٹھا لایا، اُسے دادا کے لیے بچھا دیا گیا جبکہ میں کھڑا رہا۔ وہاں اور بھی کئی لوگ تھے۔ میں انہیں جانتا تھا لیکن میری توجہ مسعود ہی کی طرف رہی۔ وہ تمام لوگوں سے الگ تھلگ اس طرح کھڑا تھا جیسے اس ساری کارروائی سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ حالانکہ یہ ساری کھجوریں جو جمع کی جانے والی تھیں اسی کی تھیں۔ گاہے گاہے جب درختوں سے کھجوروں کا بڑا خوشہ نیچے زور سے گرتا تھا تو اس کی توجہ ادھر ہو جاتی تھی۔ ایک بار اس نے چیخ کر اس لڑکے سے کہا جو کھجور کی پھنگی پر ہنسیا لیے بیٹھا تھا۔ ''اے لڑکے احتیاط سے کہیں کھجور کے دل کو نہ کاٹ دینا۔''

کسی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ کھجور پر چڑھا ہوا لڑکا بھی بے نیاز ہی رہا اور ہنسیا تیزی سے چلا چلا کر کھجوروں کے گچھے گراتا رہا۔ کھجوریں اس طرح گر رہی تھیں جیسے آسمانوں سے برس رہی ہوں۔

میں نے البتہ مسعود کے جملے پر توجہ دی۔ یعنی ''کھجور کے دل'' والی بات پر۔ میں نے سوچا یہ پیڑ بھی ذی روح ہوتے ہیں، ہماری طرح احساسات رکھتے ہیں۔ ان کے پاس بھی دل ہوتا ہے جو ہمارے ہی دل کی طرح دھڑکتا بھی ہے۔ پھر مجھے یاد آیا۔ ایک بار میں کھجور کی شاخ کو گھسیٹ رہا تھا کہ مسعود نے دیکھا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے بڑے پیار سے کہا تھا ''بیٹے! تم شاید نہیں جانتے یہ درخت جو ہوتے ہیں نا...... انہیں بھی دُکھ سُکھ کا احساس ہوتا ہے۔ اسی جملہ پر مجھے اندر سے بڑی کھسیاہٹ سی ہوئی تھی۔

دوبارہ جب میں نے ادھر نظریں اُٹھائیں تو دیکھا کہ میرے ہم عمر ساتھی، درختوں کی جڑوں کے پاس حلقہ بنائے جمع ہو چکے ہیں اور کھجوریں اٹھا اٹھا کر کھا رہے ہیں۔ پھر یہ کھجوریں ڈھیروں کی شکل میں یکجا کر دی گئیں اور لوگ آنے لگے۔ انہیں تولا جانے لگا۔ پھر تھیلوں میں بھرا جانے لگا۔ پھر کوئی تیس بورے تیار کر لیے گئے۔ مجمع رُخصت ہونے لگا۔ اب وہاں صرف دو تین افراد رہ گئے تھے۔ ایک تو سوداگر حسین تھا۔ دوسرا موسیٰ تھا جس کا کھیت قریب ہی تھا، دو اور آدمی تھے جن سے میں واقف نہ تھا۔

میں نے کچھ خرخراہٹ سی سنی تو دیکھا۔ دادا اونگھ رہے تھے اور خراٹے کی آواز ان کے منہ سے نکل رہی تھی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ مسعود نے ابھی تک جگہ نہیں بدلی ہے۔ وہ جہاں تھا وہیں تھا، وہاں کھڑا ہوا تھا۔ صرف اس نے ایک کھجور منہ میں بھی ڈال رکھی تھی جسے وہ چبا بھی نہیں رہا تھا اور اسے منہ میں لیے اس طرح کھڑا تھا جیسے سوچ رہا ہو کہ وہ اس کا کیا کرے۔

لیکا یک میرے دادا چونک گئے۔ پھر وہ ایک دم سے اُٹھے اور بوروں کی طرف بڑھے۔ ساتھ ہی ساتھ سوداگر حسین بھی چلا اور موسیٰ بھی اور وہ دونوں اجنبی بھی۔ میں نے نوٹ کیا کہ مسعود البتہ ادھر بہت دھیرے دھیرے بڑھ رہا ہے۔ بالکل جیسے اسے کوئی زبردستی ادھر بڑھا رہا ہو۔ ان لوگوں نے کھجوروں کے بورے کے چاروں طرف حلقہ بنا لیا تھا اور ان کا جائزہ لے رہے تھے۔ ایک آدھ نے کھجوریں لے کر منہ میں بھی رکھ لی تھیں۔ دادا نے ایک بورے سے مٹھی بھر کھجوریں نکالیں اور مجھے دے دیں۔ میں نے انہیں لے لیا اور کچھ کو منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔ مسعود نے البتہ ایک بورے سے دونوں ہاتھ کا چلو بنا کر کچھ کھجوریں اُٹھائیں۔ انہیں ناک تک لایا سونگھا اور پھر انہیں دوبارہ بورے میں انڈیل دیا۔

پھر میں نے دیکھا کہ وہاں جمع لوگوں نے بوروں کی تقسیم شروع کر دی۔ تاجر حسین نے دس بورے لے لیے۔ بقیہ لوگوں نے پانچ پانچ۔ میرے دادا نے بھی پانچ بورے لے لیے تھے۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے میں نے مسعود کی طرف دیکھا۔ جو ادھر ادھر اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا وہ کیا کرے۔

''تمہارے اوپر ابھی میرا پچاس پونڈ کا قرض رہ جاتا ہے۔'' میرے دادا نے مسعود سے کہا۔ ''اس کے بارے میں ہم مسجد میں باتیں کریں گے۔''

حسنین نے کچھ گدھے منگوائے، اجنبیوں کے پاس اونٹ تھے۔ ان کے بورے ان پر لادے گئے۔ ایک گدھے نے رینکنا شروع کر دیا جس سے اونٹ بدک اُٹھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں مسعود کی سمت بڑھ رہا ہوں۔ اس سے نزدیک ہو رہا ہوں اور اس کی عبا کو چھونا چاہتا ہوں۔ پھر مجھے احساس ہوا جیسے اس نے حلق میں کچھ آواز پیدا کی ہو۔ یہ آواز ایسی ہی بھنچی بھنچی تھی کہ اس پر اس بکرے کی آواز کا گمان ہوتا تھا جسے قربان کیا جا رہا ہو۔ بلا سبب، نہ جانے کیوں مجھے اپنے اندر اک اذیت ناک تشنگی سی اُبھرتی محسوس ہوئی۔

میں وہاں سے دوڑ کر تھوڑے فاصلے پر چلا گیا۔ میں نے دادا کی پکار بھی سنی مگر میں نہیں لوٹا اور چلتا رہا۔ اس لمحے واقعی مجھے اپنے دادا بہت برے سے لگے۔ مجھے ان سے نفرت سی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ لگتا تھا جیسے میرے اندر کوئی راز چھپا ہو جس سے میں چھٹکارا چاہتا تھا۔ میں دریا کے کنارے پر پہنچ گیا۔ یہیں سے وہ مڑ کر درختوں کے پیچھے جاتا تھا اور پھر نہ جانے کیوں..... میں نے اپنی اُنگلی حلق تک گھمائی اور ان کھجوروں کی قے کرنے لگا جو میں نے کچھ دیر پہلے کھائی تھیں۔

نامور مزاح نگار، سفرنامہ نگار
کالم نویس اور شاعر
ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار کا
سعودی عرب، سری لنکا، مال دیپ
ملائیشیا، سنگاپور، تھائی لینڈ اور
جنوبی افریقہ کی سیاحت پر مشتمل
منفرد سفرنامہ
''مسافر ہوں یارو''
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

افسانہ

طوطا

موپساں، فرانس/ستار طاہر

فی کیمپ کے علاقے میں رہنے والا ہر شخص ڈیزائری پیٹسن کی کہانی سے واقف ہے۔ بے چاری بدقسمت عورت، جب تک اس کا شوہر زندہ رہا اس کے ہاتھوں اس طرح پٹتی رہی جیسے گندم کو کھلیان میں کوٹا جاتا ہے۔ اس کا شوہر مچھلیاں پکڑنے والی ایک کشتی کا مالک تھا۔ اس نے اس سے شادی کر لی۔ کیونکہ وہ اگرچہ غریب تھی لیکن بلا کی خوبصورت تھی!

پیٹسن ایک مشاق اور تجربہ کار ملاح تھا مگر وحشی انسان تھا۔ وہ عموماً اپا آبان کی سرائے میں شراب نوشی کے لیے آیا کرتا تھا۔ عام طور پر وہ برانڈی کے چار پانچ گلاس ضرور پیتا تھا اور اگر موڈ اچھا ہوتا تو آٹھ دس گلاس چڑھا لیتا۔ گاہکوں کو برانڈی پیش کرنے کی خدمت اپا آبان کی بیٹی انجام دیا کرتی جو کالے بالوں والی خوبصورت لڑکی تھی۔ لوگوں کے لیے اس کے خوبصورت چہرے میں بڑی کشش تھی اور یہ دلچسپی صرف اسی حد تک تھی کیونکہ ابھی تک اس کے بارے میں نہ تو کوئی افواہ پھیلی تھی نہ لوگ گپ شپ ہی لگاتے تھے۔

پیٹسن جب سرائے میں داخل ہوتا تو اسے دیکھ کر بڑا اطمینان سا محسوس کرتا۔ وہ نرمی اور احترام سے اس کو سلام بھی کر دیتا۔ جب وہ برانڈی کا پہلا گلاس چڑھا چکا ہوتا تو وہ اسے اور بھی اچھی لگتی۔ دوسرے گلاس پر وہ آنکھوں سے اشارے کرنے لگتا۔ تیسرا گلاس پینے کے بعد وہ کہتا ڈیزائری...... کاش تم رضامند ہوتی تو...... وہ ہمیشہ اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیتا۔ چوتھے گلاس پر وہ اس کی سکرٹ کو پکڑ کر پیچھے سے تھام کر بوسہ دینے کی کوشش کرتا اور جب وہ دسویں گلاس تک پہنچ جاتا تو پھر اپا آبان اس کے لیے باقی ماندہ شراب لے کر آتا۔

بوڑھا سرائے والا کاروبار کی ساری نزاکتوں اور حربوں کو سمجھتا تھا۔ وہ اپنی بڑی بیٹی ڈیزائری کو شراب کی فروخت بڑھانے کے لیے گاہکوں کی میزوں کے درمیان بار بار بھیجتا رہتا تھا۔ ڈیزائری اپنے ابا جان کی بچی بیٹی تھی وہ اپنے باپ کے مقصد کو سمجھتے ہوئے میزوں کے گرد گھومتی اور گاہکوں سے مذاق کرتی رہتی اس کے ہونٹ مسکراتے رہتے اور آنکھیں چمکتی رہتی تھیں۔

پیٹسن کے ذہن میں ڈیزائری کا چہرہ اتنا رچ بس گیا تھا کہ وہ سمندر پر بھی ہوتا تو سمندر میں جال پھینکتے، بپھری اور پرسکون خاموش لہروں کے درمیان چاندنی راتوں اور تاریک شاموں میں بھی یہ چہرہ اس کو یاد آتا رہتا۔ جب وہ کشتی کے چپوار کی ہتھی تھامے ہوتا جب اس کے چاروں ساتھی ملاح اپنے بازوؤں پر سر رکھے سو رہے ہوتے وہ ڈیزائری کے متعلق بے اختیار ہو کر سوچنے لگتا۔ وہ جب بھی خیالوں میں اسے دیکھتا، ڈیزائری کو مسکراتے ہوئے پاتا۔ زرد رنگ کی برانڈی کو گلاس میں انڈیلتے وقت وہ وہ کندھے عجیب انداز میں حرکت دیتی اور پھر اس سے پوچھتی "یہ رہی برانڈی، کیوں اب تم مطمئن ہو؟"

وہ اس کو چشم تصور سے اتنی بار دیکھ چکا تھا کہ اس کے دل کو یہ خواہش مغلوب کرنے لگی کہ وہ اس سے شادی کر لے گا۔ اپنی اس خواہش کے آگے وہ زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا تو اس نے ڈیزائری کا رشتہ مانگ لیا۔

پیٹسن دولت مند تھا اس کی اپنی کشتی، جال اور پہاڑی کے دامن میں مکان تھا۔ اس کے برعکس اپا آبان کے پاس تو کچھ بھی نہ تھا۔ اس لیے شادی جلد ہی طے پا گئی۔ دونوں فریقین یہی چاہتے تھے کہ جتنی جلدی ہو سکے شادی کا انتظام کر دیا جائے۔ اسی لیے چند دنوں میں ہی شادی کی تقریب منعقد ہوئی اور پیٹسن ڈیزائری کو بیاہ کر لے آیا۔

شادی کے تین دن بعد ہی پیٹسن کے خیالوں کا سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر وہ کون چیز تھی جس کی وجہ سے ڈیزائری اس کو دوسری عورتوں سے مختلف اور انوکھی لگی تھی۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ میں بھی کتنا بے وقوف اور احمق ہوں کہ ایسی لڑکی کے جال میں پھنس گیا جو نادار اور مفلس ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی برانڈی میں کوئی نشہ آور چیز ملا کر اسے پلاتی رہی تھی۔

وہ سارا دن اپنے آپ پر لعنت بھیجتا رہتا۔ اپنے پائپ کو دانتوں میں چباتا اور توڑتا رہتا۔ اپنی کشتی کے ملاحوں کو پیٹنے لگتا وہ اپنا باقی غصہ ہر اُس چیز پر اُتارتا جو اس کے سامنے آ جاتی۔ گندی گالیاں بکتے اور لعنتیں بھیجتے ہوئے وہ مچھلیوں سے ٹوکریوں کو بھرتا رہتا۔ جب وہ گھر لوٹتا تو وہ اپنی بیوی، اپا آبان کی بیٹی کو دیکھتا جو اس کے منہ اور ہاتھوں کی رسائی سے دور نہ ہوئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ حقیر ترین جانوروں کا سا سلوک کرنے لگا تھا۔ بے چاری ڈیزائری اپنے والدین کے لڑائی جھگڑوں کو بھی دیکھ چکی تھی اس لیے بڑی خاموشی سے وہ سنتی رہتی۔ پیٹسن اس کی خاموشی سے مشتعل ہو جاتا اور پھر ایک شام وہ اس کو پیٹنے لگا اور ڈیزائری کے لیے اس گھر میں زندگی جہنم بن گئی۔

اِٹنبو کے قصبے میں دس برس تک لوگ ایک ہی موضوع پر گفتگو کرتے رہے تھے ڈیزائری کی پٹائی پیٹسن کا وحشیانہ پن۔ وہ معمولی اور حقیری بات پر اپنی

بیوی پر لعنت بھیجنے لگتا۔ اس کو کوستا اور روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا۔ اس علاقے کے عام لوگوں کا ذخیرہ الفاظ محدود تھا۔ پیٹسن اپنی بیوی کو گالیاں دیتے اور کوستے ہوئے نئے نئے الفاظ استعمال کرتا، نئی نئی ترکیبیں تراشتا۔ جونہی اس کی کشتی ساحل کی طرف بڑھتی اس کی آنکھیں اپنی بیوی کو تلاش کرنے لگتی تھیں اور جونہی وہ اس کو دیکھتا گالیوں، کوسنوں اور لعنتوں کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا۔ ساحل پر اُتر کر اپنی بیوی کے قریب پہنچتے ہی وہ گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتا لوگ ہنسنے لگتے۔ اگر چہ ان کو ڈیزائری سے دلی ہمدردی تھی جب وہ مچھلیاں اُتار کر دوسری جگہ منتقل کر رہا ہوتا تو قصبے کے سارے لوفر اس کی باتوں کا مزہ لینے کے لیے اس کے اردگرد جمع ہو جاتے۔ الفاظ پیٹسن کے منہ سے یوں نکلتے جیسے توپ کے منہ سے گولے نکل رہے ہوں۔ الفاظ گرجتے، پھٹتے اور دھماکہ پیدا کرتے۔ ایک آندھی سی چل نکلتی جو اس کے مضبوط پھیپھڑوں سے جنم لیتی تھی۔ کیونکہ وہ بے تکان اونچی آواز میں بولتا چلا جاتا۔

کشتی کے کام سے فارغ ہو کر جب وہ اپنی بیوی کے سامنے جاتا تو گالیوں اور سخت سست لفظوں سے بھری ہوئی ایک کشتی اس پر انڈیل دیتا۔ پھر وہ آگے آگے چل نکلتی۔ وہ اس کے پیچھے دھاڑتا اور بکتا ہوا چلتا رہتا۔ اس رعونت پر بے چاری کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ بالآخر وہ بند دروازوں کے پیچھے اپنے گھر میں اکیلے رہ جاتے۔ تب وہ کسی معمولی سی بات پر اس کو مارنے پیٹنے لگتا، کسی حقیری بات پر اس کا ہاتھ اُٹھ جاتا اور پھر نہ رُکتا۔ ہر بار اس پر وار کرتے ہوئے وہ چیختا...... بھوکی، فقیرنی، بھتنی، کمینی...... پھر وہ اپنے آپ کو کوستا جس نے اس سے شادی کی تھی۔ اس کے باپ کو گالیاں دیتا جس نے شادی کی فوراً حامی بھر لی تھی۔

بے چاری عورت...... ایک دائمی اور ہمیشہ زندہ رہنے والے خوف کے سائے میں زندہ تھی۔ اس کا جسم اس خوف سے ہمیشہ کانپتا رہتا۔ اس کی روح لرزتی رہتی۔ وہ ہمیشہ متوقع رہتی کہ اس کو پیٹا جائے گا اس کی بے عزتی کی جائے گی۔

یوں کافی سال گزر گئے۔ وہ اتنی ڈرپوک ہو چکی تھی کہ کسی سے کوئی بات بھی کرتی تو اس کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ وہ ہر وقت ایک ہی خیال میں گم رہتی کہ اس کا شوہر اس کو پیٹے گا۔ اپنے شوہر کی دھمکیوں کی عملی صورت سے وہ خائف رہتی وہ دبلی ہوتی گئی اس کی رنگت پیلی پڑتی گئی وہ سوکھ گئی تھی!!

ایک رات وہ اچانک ہڑبڑا کر جاگ گئی۔ طوفانی ہوا دھاڑ رہی تھی۔ اس کا شوہر سمندر پر گیا ہوا تھا۔ وہ اُٹھ کر بستر میں بیٹھ کر کانپنے لگی۔ جب اس نے پھر کوئی آواز نہ سنی تو پھر بستر میں لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوا چمنی میں دھاڑنے لگی اور سارا گھر ہلنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا آسمان سے خوفناک اور کریہہ جانور نیچے اُتر کر ہواؤں میں دھاڑ اور چیخ رہے ہیں۔ وہ تیزی سے اُٹھی اور بندرگاہ کی طرف بھاگنے لگی۔ چاروں طرف سے عورتیں ہاتھوں میں لالٹینیں لیے بندرگاہ کی طرف بھاگی چلی آ رہی تھیں مرد بھی وہاں جمع ہو چکے تھے۔ سمندر کی لہریں جھاگ اُڑا رہی تھیں۔

یہ طوفان پندرہ گھنٹوں تک چلتا رہا۔ گیارہ ملاح سمندر سے کبھی واپس نہ آ سکے ان میں...... پیٹسن بھی تھا۔

ڈیپی کے قرب و جوار میں پیٹسن کی تباہ حال کشتی کے کچھ ٹکڑے مل گئے۔ سال والیری کے نزدیک، ملاحوں کی نعشیں بھی مل گئیں مگر پیٹسن کی لاش تلاش کے باوجود کبھی نہ مل سکی۔ طوفان میں اس کی کشتی کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے اس لیے پیٹسن کی بیوی کو خیال آتا کہ وہ کسی تختے پر سوار ہو کر کہیں دور نکل گیا ہوگا اور ایک نہ ایک دن ضرور لوٹ آئے گا۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ یہ سمجھنے لگی کہ اس کو پیٹسن سے نجات مل گئی ہے۔ اس کے باوجود وہ کسی ہمسائے، بھکاری اور پھیری والے کی اچانک آمد پر یوں چونک اُٹھتی جیسے پیٹسن آ گیا ہو۔

اس کے شوہر کی گمشدگی کو چار برس ہو چکے تھے کہ ایک شام جب وہ ٹہل رہی تھی تو ایک مکان کے سامنے رُک گئی۔ یہ مکان ایک بوڑھے سمندری کپتان کا تھا جو تھوڑا عرصہ پہلے مر گیا تھا اور اب اس کا فرنیچر نیلام کیا جا رہا تھا۔ جب وہ رُکی تو اس وقت ایک طوطے کی بولی دی جا رہی تھی۔ طوطے کے پر سبز اور سر نیلا تھا وہ لوگوں کو غصے سے گھور رہا تھا۔

''تین فرانک'' نیلام کرنے والے نے آواز سنائی۔ تین فرانک ایک ایسے طوطے کے...... جو ایک وکیل کی طرح باتیں کر سکتا ہے۔

اس کی ایک سہیلی نے اسے کہنی مار کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا ''تم دولت مند ہو۔ یہ طوطا تمہیں خرید لینا چاہیے۔ تم تنہا ہو یہ اچھا ساتھی ثابت ہوگا۔ ویسے بھی اس کی قیمت تین فرانک سے زیادہ ہے اور جب بھی تمہارا دل اس سے بھر جائے تو اسے تم پچیس فرانک کے بدلے بیچ بھی سکتی ہو۔

پیٹسن کی بیوہ نے بولی میں پندرہ پیسو کا اضافہ کیا تو پرندہ اس کو دے دیا گیا جو ایک چھوٹے سے پنجرے میں بند تھا۔ وہ پنجرہ اٹھا کر گھر لے آئی۔ جب اس کے پانی پلانے کے لیے اس کا پنجرہ کھولا تو طوطے نے اس کی اُنگلی کاٹ کھائی اور خون بہنے لگا۔

اوہ...... یہ کتنا شریر ہے۔ وہ کہنے لگی۔

اگلی صبح جب دن طلوع ہو رہا تھا پیٹسن کی بیوہ نے ایک اونچی گہری اور دھاڑتی ہوئی غیر معمولی آواز سنی۔

مردار کیا تم اُٹھو گی نا ہیں......

یہ آواز سن کر خوفزدہ ہوگئی۔ اس نے اپنا سر چادر کے نیچے چھپا لیا۔ کیونکہ جن دنوں پیٹسن گھر میں ہوتا تھا تو جونہی اس کی آنکھ کھلتی تھی وہ اس کو اسی طرح مخاطب کر کے یہ جملہ کہا کرتا تھا۔

کانپتے اور لرزتے ہوئے وہ گیند کی طرح سمٹ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ تکیوں کے نیچے چھپا لیا۔ اسے توقع تھی کہ ابھی اس کی پٹائی شروع ہو جائے گی۔ وہ بڑبڑانے لگی...... اوہ میرے خدا...... وہ یہاں آ گیا...... اچھے خدا...... وہ لوٹ آیا...... وہ واپس آ گیا۔ کئی لمحے گزر گئے کسی آواز نے کمرے کی خاموشی کو نہ توڑا۔ کانپتے ہوئے اس نے اپنا سر اُوپر اُٹھایا وہ ضرور کہیں چھپ گیا ہے۔

کافی دیر تک وہ انتظار کرتی رہی۔ پھر اس نے اپنے اندر حوصلے کو پیدا کیا اور اپنے آپ سے کہنے لگی...... یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ میں نے خواب دیکھا ہوگا۔ جب اسے اپنی بات پر کچھ یقین آ گیا تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ابھی اس نے آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ اسے اپنے قریب سے ایک خوفناک، گرجتی اور دھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ڈوبے ہوئے آدمی کی چیخ کی طرح تھی۔

تم جس کسی چیز پر بھی ایمان رکھتی ہو اس کی قسم کھا کر کہو کہ کب اُٹھ رہی ہو...... کتیا! وہ چھلانگ لگا کر ایک تابع، کمزور اور مار پیٹ کی عادی عورت کی طرح اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ یہ آواز کبھی نہ بھولی تھی اور نہ ہی کبھی بھول سکتی تھی۔ پیٹسن میں اُٹھ گئی ہوں۔ حکم کرو، تمہیں کیا چاہیے۔

پیٹسن نے کوئی جواب نہ دیا۔

حیران و ششدر وہ اپنے آس پاس دیکھنے لگی۔ اس نے چمنی میں بھی جھانک لیا بستر کے نیچے بھی دیکھا۔ پھر ہر طرف سے ناکام ہو کر کرسی پر گر پڑی، پریشان اور فکر مند۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پیٹسن کی روح واپس آ گئی ہے صرف اس کو اذیت پہنچانے کے لیے......

اچانک اس کو بالاخانے کا خیال آیا۔ وہ سیڑھی کی طرف لپکی۔ یقیناً وہ اسے حیران اور پریشان کرنے کے لیے بالاخانے میں چھپا ہوا ہوگا۔ اسے یقیناً وحشیوں اور سمندری ڈاکوؤں نے قید کر لیا ہوگا اور اب وہ ان سے جان بچا کر بھاگ آیا ہے۔ یقیناً یہ اسی کی آواز تھی۔ اس نے سر اُٹھا کر آواز دی ’’پیٹسن کیا تم اِدھر ہو۔‘‘

پیٹسن نے کوئی جواب نہ دیا۔

لرزہ خیز خوف سے اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ تیزی کے ساتھ سیڑھی پر چڑھ گئی۔ بالاخانہ کا دروازہ کھولا مگر اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ سوکھے گھاس پر بیٹھ کر وہ چیخنے اور رونے لگی جس وقت وہ رو رہی تھی اور ایک ماورائی غیر فطری اور شدید خوف سے مغلوب ہو چکی تھی اس نے پیٹسن کے باتیں کرنے کی آواز نچلے کمرے سے آتی ہوئی سنی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے بھوک لگی ہو وہ کہہ رہا تھا۔

کتنا ناخوشگوار موسم ہے۔ اوہ یہ خوفناک ہوا، گندہ موسم لعنت ہو میں نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔ وہ چھت پر سے ہی جلد اُتر آئی۔ پیٹسن میں یہاں ہوں۔ تم ناراض کیوں ہوتے ہو میں ابھی تمہارا کھانا تیار کرتی ہوں۔ وہ بھاگ کر نیچے پہنچی، وہاں کمرے میں کوئی نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو لاغر اور نحیف محسوس کرنے لگی جیسے موت اس کو مجبور کر رہی ہو۔ وہ بھاگ کر کسی ہمسائے کی مدد حاصل کرنا چاہتی تھی کہ اس نے اپنے قریب ہی ایک آواز سنی...... اوہ...... میرے خدا...... میں نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا۔

طوطا اپنے پنجرہ میں سے اپنی گول، شیطنت سے بھری ہوئی سب کچھ جاننے والی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ خود اس کو وحشت سے دیکھ رہی تھی پھر بڑبڑانے لگی ’’اچھا...... تو یہ تم تھے۔‘‘

طوطے نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا ’’بس تم ذرا انتظار کرو پھر میں تمہیں بے کار بیٹھنے کا مزہ چکھاؤں گا۔‘‘

اس کے اندر جانے کیا کچھ ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی محسوس کر چکی تھی کہ وہ مردہ شخص واپس آ چکا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو اس پرندے کے پروں میں چھپا لیا ہے تاکہ وہ اس کو اذیت پہنچاتا رہے۔ پہلے کی طرح سارا دن اس کو کاٹتا رہے۔ اس کو کوستا رہے۔ اس پر لعنتیں بھیجتا رہے تاکہ ہمسائے اس کی باتیں سن کر ایک بار پھر اس پر ہنسنے لگیں۔ وہ تیزی سے پنجرے پر جھپٹی اور پرندے کو پکڑ لیا جو اپنی چونچ اور پنجوں سے اس کا گوشت اُدھیڑتا رہا لیکن اس نے طوطے کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے جکڑ رکھا تھا۔ اس نے طوطے کو زمین پر پھینکا اور ہذیانی جوش کے ساتھ اس کو کچلنے لگی۔ اس نے اس کو کچل کر رکھ دیا۔ اب وہ ایک چھوٹا سا سبز رنگ کا مڑا تڑا طوطا تھا جو نہ حرکت کر سکتا تھا نہ بول سکتا تھا۔ اس نے اس کو ایک کپڑے میں یوں لپیٹ دیا جیسے وہ کفن ہو۔ پھر وہ رات کا لباس ہی پہنے ہوئے ننگے پاؤں چلتی ہوئی گودی کی طرف بڑھتی چلی گئی جس کے ساتھ سمندر کی لہریں ٹکرا رہی تھیں۔ اس نے کپڑے کو جھٹکا دیا اور وہ چھوٹی سی مردہ چیز جو گھاس کی طرح نظر آ رہی تھی پانی میں گر گئی۔ گھر واپس پہنچ کر وہ خالی پنجرے کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ وہ جو کچھ کر کے آئی تھی اس واقعے نے اس کو مغلوب کر رکھا تھا۔ جھک کر وہ معافی مانگنے لگی جیسے اس نے کوئی قابل نفرت جرم کیا ہو۔

عالمی ادبی شعری تراجم

جب جنگ تمام ہوجائے گی

جب جنگ تمام ہوجائے گی
ہم ظاہر ہے اترائیں گے
ہوا بالآخر سانس لینے کے قابل ہوجائے گی
پانی سنور چکا ہوگا
سلمن مچھلی اور آسمان کی خاموشی
زیادہ مکمل طور پر ہجرت کرے گی
مردے سوچیں گے جینے والے اسی لائق ہیں
ہم جان لیں گے کہ ہم کون ہیں
اور پھر ہم سب دوبارہ بھرتی ہوجائیں گے

ڈبلیو-ایس-مروِن (امریکہ)/شاداب احمد

ہائیکو

بڑا اوا
کھانستا ہے
تتلیاں

....

بغیر پیسوں کے
میں جاتا ہوں
برف کا نظارہ کرنے

....

فربہ خاتون
ٹماٹروں پر جھکتی ہے
ایک پورا چاند

اینی پڑاریلی (امریکہ)/رفیق سندیلوی

کیا تم خیالوں میں منہمک بیٹے ہو

آشنا چہرے بمشکل ڈھونڈ پاتے ہیں
کہر آلودہ دریچوں کے شیشے
چاندی کی گاڑھی ہوتی ہوئی دودھیا روشنی
روحوں کو بہائے لیے جاتی ہے
روشنی کی آخری لکیر کنارہ، اُفق سے کاٹ گئی ہے
جس سے لمحہ چیخ اُٹھتا ہے
اپنے واضح پن کے ساتھ!

لازم ہے کہ میں اور تم چاندی کی وساطت سے ترسیل ہوں؟
یہ حقیقت کا ایک پرتو ہے
تمہارا جام دُوری کی روشنی ہے جو درختوں کو
مس کرکے گزرتی ہے
جھلملاتے ہوئے پانی کی طرح
آسماں اس منظر کو منعکس کردیتا ہے
میرے ساتھی! میں حیران ہوں کہ کیا تم خیالوں میں
منہمک بیٹے ہو
میں گہرے رنگوں کو پرندوں کی ہیئت میں تراشتی ہوں
اپنی کھڑکیاں پوری طرح کھولو
میرا تحفہ قبول کرو
اپنے تمام تر چھوٹے موٹے عقیدے کے ساتھ
میں تمھیں مشرق کی پہنائیاں پیش کرتی ہوں

سانڈرا فاؤلر (امریکہ)/رفیق سندیلوی

ہائیکو

بہار کے اول دن ہی
برف باری
ایک شاخ سے دوسری شاخ تک

....

خموشی
چاندنی میں
پتھروں کی

ورجینا بریڈی ینگ (امریکہ)/رفیق سندیلوی

کاغذ کے آدمی

ایک قطار میں
کاغذ کے آدمی..... ہاتھوں میں ہاتھ دیے
نہایت صبر سے
اپنے گنے جانے کا انتظار کرتے ہیں
اور قینچی کے پہلے وار کا

ان میں سے ہر ایک
ایک بہت اہم کڑی ہے
اس پابہ زنجیر گروہ کی
جس میں انہیں کاٹا گیا ہے
انہوں نے نہ تو کوئی زرہ پہنی ہوئی ہے
نہ کوئی خود
انہیں کسی کارنامے کی تمنا نہیں ہے

عالمی ادبی شعری تراجم

نہ کسی شہرِ خواب میں فرار ہونے کی
ان کی سب سے اہم خوبی
ان کی لچکداری ہے
کاٹے جاتے وقت
ان کی سب سے بڑی خوشی یہی ہوتی ہے
کہ......ان کی ریڑھ کی ہڈی نہیں ہے!

پیگی والڈران (امریکہ) / خاور احمد

ریڑھ کی ہڈی کے زائیلوفون پر

دھن بجاتے ہیں کون و مکاں
میرے فقرات کے زائلوفون پر
سر بھرے تار مہروں کے چھوتے ہوئے
مرتعش کر رہے ہیں مجھے درمیان کر
خواہشِ جسم کی گونج سے
دھن پہ نغماتِ افلاک کی

گوشت جب ہڈیوں سے گرے گا تو سر
اور واضح ہوں گے
جلد مرجھائے گی
روح اپنے سفر پر نکل جائے گی
سر، ہوائے خزانی کی صورت کھلیں گے
شکستہ سے جھڑتے ہوئے پات ہوں جس طرح
یا ہماری زمیں پر چمکتے ہوئے پانیوں کی طرح
دور سے دیکھتی ہے جنہیں
ایک مخلوق......سنگیت سے جس کی تخلیق ہے
آنکھ پر جو عیاں تک نہیں
لمس بھی جس کا ناممکنات
کس کو یارا ہے اس سے ملاقات کا
ہاں مگر جب اُترتی ہے دھرتی پہ وہ
ناتواں استخواں پر ہمار
کوئی دھن بجانے
اس طرح سے تھم جائے
حرف جیسے دل والی

جس کا لیکن ابد حسن بھی
ایک سانس ہی تو ہے
حرف جو قلم کے ہیں
وہ بھی ہیں رضا دل کی
اور ڈوب جاتی ہے
ظلمتوں میں سب دنیا
ہاں مگر ستاروں کے
پختہ عزم سے پیچھے

اریکا ڈونگ (امریکہ) / سعید احمد

سیاہ

لحاف کہنہ بوسیدہ فلک جو پھٹا
تو شہر و کوچہ سراسر ہوئے ہیں پنبہ سے پر
مگر ہے دشت ابھی بھی غریب و سرد و خموش
ارے! نہ جھاڑ در و بام پر ہمارے نہ جھاڑ
یہ اپنا پھٹا پرانا لحاف، گرچہ سدا
ہمارے پیچھے پہ آفت کا راج ہی تو رہا
وہ دشت سوختہ تھی پنبہ سپید سے ہے
جہاں بھی حرف حریفاں پہ پنبہ ہے در گوش

فریدون مشیری (امریکہ) / علی و پیک قزلباش

ترانہ دیدار

تمہارے ساتھ رہنا اچھا ہے
اور تمہاری باتیں
اندھیرے میں خوشبو کی طرح

تمہارے لباس کی مہک
سمندر کی خوشبو کی طرح نمناک
گرمیوں میں ٹھنڈی ہوا کی طرح!
اندھیرے کی طرح خوابناک!

تمہارے ساتھ گفتگو
انگیٹھی کی گرمی اور بھڑکتی ہوئی آگ کے سانسوں کی طرح
میرے تصور و خیال کی آنکھوں کو
یادوں کے دور دراز جنگلوں میں لے جاتی ہے
جہاں گندم کے خوشوں پر چڑیاں
رقص کرتی ہیں
جہاں پھول اور ستارے ایک دوسرے کے راز دار ہیں

منوچہر آتشی (امریکہ) / معین نظامی

عالمی ادبی شعری تراجم

طوفان نوح

میں نے مٹھی بھر شگوفے
پانی میں ڈالے
آسمان بھر ستارے نکل آئے!
پھر میں نے پتوں جیسے ایک نازک کاغذ سے
ایک ہتھیلی بھر کشتی بنائی
اور موم کا ایک ناخدا (خدا سے چھوٹا)
اس پر مقرر کیا
وہ میری کشتی کو
اپنے ساتھ دور لے گیا...... بہت دور
ان شگوفوں تک
ان ستاروں تک
خوشبو اور روشنی سے لبریز ان جزیروں تک لے گیا
وہ ہر ایک کے پاس کچھ ٹھہرا
جیسے ایک ایک کا دوست ہو!
پھر مغرب کے اُفق سے ہوا چلی
کشتی کسی بلبلے کی طرح پانی پر گوں سار ہوگئی
اور ناخدا نے چپو موجوں کے ہاتھ میں دے دیے......
اب میری چھوٹی سی دنیا، خدا سے خالی ہے

نادر نادر پور (امریکہ) / معین نظامی

دستخط

دستخط...... سمجھوتے کے، بیاہ کے، مکان بیچنے کے،
گواہی کے
دستخط...... بنک کے، وارنٹ کے، ایڈیٹر کے،
منی آرڈر کے
دستخط...... رسیدی ٹکٹ کے، چیک کے، قرقی کے،
اور......اور......اور
کچھ دستخط کیلوں جیسے ہوتے ہیں، کچھ پھولوں جیسے
کچھ تلوار کی دھار جیسے، کچھ بجلی کی لکیر جیسے
کچھ دستخط پھولے ہوئے اور موٹے لفظوں جیسے،
کچھ پھیکے اور چھوٹے حرفوں جیسے
کچھ وحشی سے، کچھ ڈرے ڈرے بزدل سے
کچھ سیدھے اور سادہ، کچھ ٹیڑھے میڑھے سے
کچھ آسان، کچھ گھسان، کچھ نرم، کچھ گرم
کچھ اُلجھے ہوئے، چکر سے کھاتے ہوئے......
کچھ رعب داب والے، کچھ چھیلے اور بھڑکیلے سے
کیسے کیسے ہوتے ہیں...... لوگوں کے دستخط
کچھ کا پڑھا جانا بھی مشکل، کچھ کا سمجھ میں آنا بھی مشکل
اور ان کے ساتھ چل سکنا بھی مشکل
لیکن دوست! میری ماں کچھ بھی لکھنا نہیں جانتی
لیکن جب انگوٹھا لگاتی ہے
تو ماں کے انگوٹھے میں بنا سنکھ، کاغذ پر بہت خوبصورت
دکھائی دیتا ہے......

چی اود (امریکہ) / احمد سلیم

کبوتر

سب سے خوبصورت کبوتری
آج صبح صبح مر گئی
میں نے اس کے ٹھنڈے اور مردار جسم کو اُٹھایا
اور یخ زمین میں دبا دیا
کبوتر تنہا ہو کر
بادلوں سے اُوپر، دوسرے کبوتروں کے ساتھ اُڑنے لگا
صبح کی روشنی میں اس کے پر گرتی پتیوں کی طرح کی
آواز پیدا کر رہے تھے
اور پھر وہ سب سے الگ، سب سے جدا تھا
اس کا غم شدید اور بے پناہ تھا
اس کی غمناک آواز
آنے والی موت کا نوحہ بنی ہوئی تھی

ہماری زندگیاں بھی یونہی ختم ہو جاتی ہیں
ہم بھی یونہی تنہا رہ جاتے ہیں
مگر ہمارے پاس اُڑنے کے لیے پر نہیں ہوتے ہیں
ہم درد کی شدت سے مضطرب زندہ رہنے پر مجبور ہیں

الیگزینڈر گروف (امریکہ) / کشور ناہید

ارژنگ: آپ نے شعر میں کرافٹنگ کا عمل کہاں سے سیکھا؟ اور اگر کسی نے نہیں سکھایا تو کیا آپ نے یہاں تک کا سفر اکیلے ہی طے کیا ہے؟

اعزاز احمد آذر: جی ہاں۔ ان معنوں میں، میں نے شاعری میں کسی کی خاص شاگردی نہیں کی۔ میرا استاد زمانہ، وقت اور حالات رہے ہیں اور اس سے پہلے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں دراصل مطالعے، مشاہدے اور اپنے سینئرز کے علاوہ اپنے ہم عصروں کی ہم نشینی اور ہم مجلسی کو بھی اس ضمن میں اپنا اُستاد سمجھتا ہوں کہ ان سب باتوں سے مجھے شعر فہمی اور فن شناسی کا موقع ملا۔

ارژنگ: اب تک آپ کے کتنے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

اعزاز احمد آذر: میرے اب تک چار شعری مجموعے اور ایک کتاب بچوں کی نظمیں چھپ چکی ہے۔ دھیان کی سیڑھیاں، محبت مشغلہ تھی، موسم سی برساتاں دا، کب صبح ملن ہوگی اور تتلی پھول اور چاند۔ اس کے علاوہ چھٹا مجموعہ زیرِ طبع ہے ''تم ایسا کرنا''۔ اس کے علاوہ ایک انتخاب کیا تھا میر تقی میر سے اعزاز احمد آذر تک۔ کوئی دو سو پچیس شاعروں کی ساڑھے چار سو غزلیں۔

ارژنگ: یہ انتخاب میر سے اعزاز احمد آذر تک ہی کیوں رہا؟ کیا آپ کے بعد اور کوئی قابلِ ذکر شاعر نہیں ہے؟

اعزاز احمد آذر: میں نے یہ دانستہ کیا ہے ''اعزاز احمد آذر تک'' اس انتخاب میں میں نے سب سے آخر میں اپنی غزل رکھی ہے۔ یہ ایک میرا سوچا سمجھا اقدام تھا۔ دراصل میں اس انتخاب میں اپنے ہم عصروں اور اپنے سے جونیئر شعراء کو بھی جن کا کلام میں نے منتخب کیا ہے انہیں احترام دینا چاہتا تھا اور ان سب کا کلام پہلے نمبروں پر رکھا ہے۔

ارژنگ: آپ نے لفظ جونیئر کا انتخاب کیا ہے۔ شعرو ادب میں اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟

اعزاز احمد آذر: اس میں بنیادی بات ماہ و سال کی ہے۔ یہ فطرت کا ایک اصول ہے دُنیا میں بعد میں آنے والا شخص اپنے پہلے آنے والے کا جونیئر ہے۔ یہ وضاحت میں نے آپ کے سوال میں موجود مخصوص یعنی سینئر جونیئر کی بنیاد پر کی ہے۔ اچھے برے کی نہیں جبکہ مشاعروں میں تقدیم و تاخیر کا حوالہ معیارِ کلام بھی ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی ماہ و سال کے حوالے سے جونیئر اور سینئر ہونے کو ملحوظ رکھنا ضروری بھی ہے اور مناسب بھی۔

ارژنگ: آپ کالم نگاری بھی کرتے ہیں لیکن آپ کو بطور کالم نگار وہ شہرت نہ مل سکی جو آپ کی شاعری کے حصے میں آئی؟

اعزاز احمد آذر: اصل میں کالم نگاری کو نہ تو پیشہ ورانہ طور پر اختیار کیا اور نہ میں نے اپنے آپ کو ہمہ وقت کالم نگار کے طور پر اسٹیبلش کیا ہے۔ یہ دراصل اُفتادِ طبع کی بات ہے کہ زندگی میں سماج میں اور ہمارے اردگرد کے عمومی ماحول میں بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جو اپنی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور ان پر ذہنی اور فکری سطح پر ردِعمل پیدا ہوتا ہے۔

ارژنگ: آپ کی نظر میں ہمارے ہاں پیشہ ور کالم نگار کون سے ہیں؟

اعزاز احمد آذر: ایک طویل فہرست ہے اور ممکن ہے کہ نام لکھے جائیں تو بہت سے نام فوری طور پر ذہن میں نہ بھی آئیں اور یہ بھی ہے کہ معاشرے کے مختلف طبقے کے لوگ مختلف طرح کے اخبارات اور کالم نگاروں کے قارئین ہوتے ہیں جو ضروری نہیں کہ سب کالم نگاروں سے واقف ہوں لیکن اگر چیدہ چیدہ بر سبیل تذکرہ نام لیا جائے تو ان میں ارشاد احمد حقانی، نذیر ناجی، عبدالقادر حسن، عطاء الحق قاسمی، حسن نثار، منو بھائی، خالد حسن، ارشاد عارف، عباس اطہر، ظفر اقبال وغیرہ وغیرہ۔

ارژنگ: آپ بیک وقت شاعر، کالم نگار اور ڈرامہ نگار ہیں۔ اگر آپ کو ان تینوں شعبوں میں اپنے پسندیدہ ایک ایک بندے کا نام لینے کو کہا جائے؟

اعزاز احمد آذر: کالم نگار منو بھائی، شاعر احمد فراز اور ڈرامہ نگار بھی منو بھائی ہی ٹھیک ہیں۔

ارژنگ: کسی بھی شاعر اور ادیب کا معاشرے میں کیا کردار ہونا چاہیے؟

اعزاز احمد آذر: شاعر اور ادیب کا معاشرے میں وہی کردار ہوتا ہے جو قدرت نے اسے تفویض کر کے دنیا میں بھیجا ہے اور اس کردار کی یا اس مطلوبہ کردار کی نشاندہی اس کی فکر اور اس کا کلام کرتا ہے۔ شاعر کسی بھی زمانے کا ہے اور کسی بھی زبان کا زندگی معاشرے اور عموماً انسانی ماحول میں وہ جس خوبصورتی، خیر بھلائی

کا، جمالیات کی علامت ہے اور یہی سب کچھ یا اس سب کچھ کا اگر اس کے عملی کردار میں بھی اپنی جھلک دے تو آپ کے سوال کا جواب مجسم صورت میں سامنے آ جاتا ہے۔

ارژنگ: آپ کے ہاں غم روزگار کی نسبت غم جاناں کی کیفیات نمایاں ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

اعزاز احمد آذر: یہ محض اتفاق ہے کہ آپ کی نظر سے زیادہ ایسا کلام گزرا ہے لیکن اگر یوں بھی ہو تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ جو میرے بارے میں اے بی اشرف نے لکھا ہے کہ میں محبت کا شاعر ہوں تو میں واقعی محبت کا شاعر کہلانا پسند کرتا ہوں لیکن یہ محبت ہمہ جہت محبت ہے۔

ارژنگ: پنجابی زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے کس حد تک سوچتے ہیں؟

اعزاز احمد آذر: میں بنیادی طور پر پنجابی ہوں اور میری ذہنی اور فکری پرورش میں پنجاب کی ثقافت اور پنجابی زبان نے ایک مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ چنانچہ میں اصولی طور پر بات کا قائل ہوں کہ پنجاب میں نہ صرف پنجابی زبان کو بلکہ پاکستان کے تمام باقی خطوں میں باقی زبانوں کو سرکاری غیر سرکاری اور عمومی سطح پر وہ حیثیت حاصل ہو جو ان کا حق ہے اور یہی ساری ثقافتیں پاکستان کی مجموعی ثقافت کو ''رچ'' بنانے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ میں یہاں یہ وضاحت ضرور کر دوں کہ عالمی پنجابی کانگریس کے حوالے سے اب نہیں بلکہ اعزاز احمد آذر 1968ء اور 1969ء سے مرحوم مشتاق بٹ کے فورم ویس پنجاب محاذ سے پنجابی زبان زبان ادب اور ثقافت کا کارکن ہے۔

ارژنگ: آپ نے پنجابی زبان و ادب کے لیے اب تک جو جدوجہد کی اس کا کوئی نتیجہ نکلا؟

اعزاز احمد آذر: بہت زیادہ تفصیل میں جائے بغیر جس کا میں تذکرہ اپنے بہت سے مضامین، کالموں اور مختلف تقریبات میں کر چکا ہوں محض یہ بات کافی ہے۔ میں جس جدوجہد کرنے والے قافلے کا رُکن ہوں یہ دراصل اسی کی تگ و دو کا حاصل ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے پنجابی ایم اے کی کلاسز کا اجراء کر دیا ہے اور ریڈیو پر پنجابی میں خبریں اور دوسرے پروگرام نشر ہونے لگے اور ان میں کافی حد تک اضافہ بھی ہوا ہے۔

ارژنگ: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پنجابی زبان و ادب کے فروغ کے لیے عالمی پنجابی کانگریس صحیح سمت سفر کر رہی ہے؟

اعزاز احمد آذر: یہ ایک ایسی بات ہے جس پہ متضاد آراء دی گئی ہیں اور میں اصولی طور پر سمجھتا ہوں کہ عالمی پنجابی کانگریس کے چیئرمین فخر زمان کو چاہیے کہ بہت بنیادی اور مختصر ایجنڈے کو اپنے منشور کی بنیاد بنائیں اور بہت واضح دوٹوک اور قطعی قسم کی سوچ رکھنے والے افراد کو اپنا ہم سفر بنائیں لیکن محض عددی گنتی بڑھانے کے خیال میں ان لوگوں کو اپنا رفیق نہ سمجھیں جو محض نام و ناموس اور دیگر مفاد کی خاطر ہر قافلے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ہمیں بے شمار نادان دوستوں کی نسبت محض گنتی کے چند کھرے ساتھیوں کی ضرورت ہے۔

(یہ انٹرویو کچھ عرصہ قبل ارژنگ کے لیے کیا گیا تھا جو کہ عامر بن علی اور ابرار ندیم کی انٹرویوز پر مشتمل کتاب ''گفتگو'' میں بھی شامل ہے۔)

نظم

عجب سماں ہے
کہ بند آنکھوں سے تک رہی ہوں
گلاب رُت کے بہار منظر
کی آہٹوں سے مہک رہی ہوں
وہ نرم خوشبو کی طرح دل میں اُتر رہا ہے
میں قربِ جاں کی لطافتوں سے بہک رہی ہوں
یہ چاہتوں کی حسین بارش کا معجزہ ہے
کہ میری پوری سُلگ رہی ہیں
میں قطرہ قطرہ پگھل رہی ہوں
میں رنگ و خوشبو کا لمس پا کر
وفا کے پیکر میں ڈھل رہی ہوں
نہ میں زمیں پر نہ آسماں میں
وہ ایسا جادو جگا رہا ہے
گلابی بارش سنہرے سپنوں
کے سارے مطلب
وہ دھیرے دھیرے بتا رہا ہے
مجھے وہ مجھ سے چُرا رہا ہے

نازبٹ، لاہور

غزل

جاگ کر رات ہم گزاریں گے
بے وفا تیرا قرض اُتاریں گے
کیا بنے گا کہو اندھیروں کا
آپ زُلفیں اگر سنواریں گے
مسکرا کر ملیں گے کب ہم سے
صدقہ حسن کب اُتاریں گے
آنسو شاہدؔ نہ جائیں گے یونہی
اپنی آنکھوں کو ہم نکھاریں گے

شاہد عباسی، لاہور

بقیہ انٹرویو ظفر اسلام

ارژنگ: کس صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور پہلی تخلیق کہاں شائع ہوئی؟

ظفر اسلام: ابتدا تو غزل سے ہی کی تھی اور زیادہ تر شاعری بھی اسی صنف میں ہے۔ البتہ اب رُجحان نظم کی طرف بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ شروع میں اُردو میں شاعری کے بعد پنجابی زبان کو ہی اپنے اظہار کا مستقل وسیلہ بنا لیا۔ کیونکہ اس میں مجھے شاعری کرنے میں سہولت محسوس ہوتی ہے۔ پہلی غزل جمیل پال کے میگزین ''سویر'' میں شائع ہوئی۔

ارژنگ: آپ ادبی گروہ بندیوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ظفر اسلام: میرے خیال میں یہ فطری ہیں۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ خود غرض ہے اور اسی تناظر میں آپ دیکھیں کہ بچے بھی چھوٹی چھوٹی چیزوں اور باتوں میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ اسی طرح ادیبوں کی لڑائیوں کی بھی بہت سی وجوہات ہیں۔ معاشی مفاد ہیں۔ معاشرتی مفاد ہیں۔ خودنمائی اور پذیرائی کے معاملے میں میڈیا پر نظر آنے کے مسائل ہیں، مشاعرے ہیں اس لیے جہاں مفادات کا ٹکراؤ ہوگا وہاں گروہ بندیاں ہوں گی۔ سوُمثبت سوچ پیدا کرنے کی ضرورت ہے اچھی گروہ بندیوں میں رہتے ہوئے بھی ایسی ادبی فضا پیدا کی جا سکتی ہے جس سے بڑا ادب تخلیق پائے۔

ارژنگ: کیا آج کا ادیب عصر حاضر کے تقاضے پورے کر رہا ہے؟

ظفر اسلام: عصری ادب تخلیق کرنے کی حد تک تو کر رہا ہے موجودہ صدی کے انسان کو جن مسائل کا سامنا ہے اس کا اظہار، شاعری، ناول اور افسانے کے علاوہ ادب کی دیگر اصناف میں بھی ہو رہا ہے۔ مگر عملی طور پر ادیب اس میں زیادہ کوشاں نظر نہیں آتا۔ اس حوالے سے بھی اُسے سرگرم ہونے کی ضرورت ہے۔ تاکہ اس کے کردار کی اہمیت میں اضافہ ہو۔

ارژنگ: آپ عصر حاضر کا بڑا شاعر کسے مانتے ہیں؟

ظفر اسلام: یہ بڑا عجیب و غریب اور اُلجھا ہوا سا سوال ہے۔ بچپن میں آپ کے نزدیک بڑا ادیب وہی ہوتا ہے جسے آپ پڑھ رہے ہوتے ہیں بعد میں جیسے جیسے مطالعہ اور مشاہدہ بڑھتا جاتا ہے آپ کے آئیڈیل بھی بدلتے جاتے ہیں۔ پھر یہ ہے کہ موضوعات کے حوالے سے مختلف موضوعات پر مختلف ادیبوں اور شاعروں کا کام بڑا ہوتا ہے۔ بہرحال جواب کو آسان بناتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ اس وقت میرے پسندیدہ شاعر منیر نیازی ہیں۔ عصر حاضر کے بڑے شاعر کا فیصلہ کسی اور سے کروالیں میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔

ارژنگ: ادبی تقاریب میں کس حد تک شریک ہوتے ہیں؟

ظفر اسلام: ادبی تقریبات میں شریک ہونے کا زیادہ شوق نہیں اور پھر آسٹریلیا میں تو تقریبات ہوتی بھی کم اور کبھی کبھار ہیں۔ اس لیے چلا جاتا ہوں۔ صرف اس غرض سے کہ شاید کچھ سیکھنے کو مل جائے۔ کیونکہ بڑے بڑے ادیب آسٹریلیا آتے رہتے ہیں۔ اُن سے ظاہر ہے ہم جونیئرز کو سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

ارژنگ: ادب کے فروغ اور ترویج کے لیے میڈیا کے کردار سے مطمئن ہیں۔

ظفر اسلام: ادب کے فروغ اور ترویج میں میڈیا کا کردار نہ ہونے کے برابر ہے۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان میں نیوز چینلز کی بھرمار ہے مگر ایسے چینلز بہت کم ہیں جو صحیح معنوں میں اچھے اور تعمیری پروگرام پیش کریں۔ گزشتہ چند دہائیوں میں بڑے بڑے ادیب اور نابغہ روزگار ہستیاں چلی گئی ہیں۔ ان چینلز نے کسی کی زندگی اور یادوں کو محفوظ کرنے کی کوششیں نہیں کی۔ فضول پروگرام نشر کرتے رہتے ہیں۔ مگر ادبی پروگراموں کو اہمیت نہیں دیتے۔ لے دے کے پی ٹی وی پر ایک پروگرام نشر ہوتا ہے وہ بھی اتنا معیاری نہیں ہے۔ ادب کے لیے علیحدہ چینلز کی ضرورت ہے۔

ارژنگ: آپ آسٹریلیا میں کب سے مقیم ہیں اور وہاں کی ادبی فضا کیسی ہے؟ وہاں آپ کون سی تنظیم سے وابستہ ہیں؟

ظفر اسلام: میں آسٹریلیا میں گزشتہ 18 سال سے مقیم ہوں۔ یہاں کی واحد معروف اور بڑی ادبی تنظیم اُردو سوسائٹی آف آسٹریلیا ہے جس کا پہلے 6 سال رکن رہا۔ اس کے تحت کافی ادبی پروگرام منعقد ہوئے۔ پھر الیکشن میں اسی تنظیم کا میں جنرل سیکرٹری منتخب ہوا جو کہ گزشتہ چار سال سے ہوں۔ اس کے موجودہ صدر غلام عباس گیلانی ہیں۔

ارژنگ: ماہی آرٹس اینڈ کلچر کے قیام کو اگرچہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ یہ سفر چند برسوں پر محیط ہے۔ پھر بھی اس کے زیر انتظام بہت سے یادگار پروگرام کرا چکا ہوں۔ اس کے قیام کی وجہ یہ تھی کہ یہاں آسٹریلیا میں

انڈین کمیونٹی کے ایسے پلیٹ فارم موجود ہیں جس میں انڈین کلچر کو پرموٹ کیا جاتا ہے اور بالی ووڈ کے فن کار یہاں آتے رہتے ہیں۔ تو مجھے خیال آیا کہ ایک پلیٹ فارم ایسا بھی ہونا چاہیے جہاں پاکستانی فنکاروں کی بھی پذیرائی ہو اور یہاں پاکستانی ادب اور کلچر کے لیے کام کیا جائے۔ لہٰذا پاکستانی اسٹیج ڈرامے کو آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں پہلی بار میں نے متعارف کرایا۔ اب تک جو فن کار اس پلیٹ فارم سے یہاں پرفارم کر چکے ہیں اُن میں امان اللہ، افتخار ٹھاکر، امانت چن، ناصر چنیوٹی، آغا ماجد، میگھا، ماہ نور، صائمہ خان، ظفر خاں اور گلوکاروں میں غلام عباس اور ضم ماروی آ چکے ہیں۔ مگر یہاں توقع سے کم Response ملا۔ پاکستانی کمیونٹی کے لوگوں کو فیملی کے ساتھ تقریبات میں شرکت کرنے کی عادت نہیں ہے شاید اس لیے۔ ابھی میں نے مستقبل میں جو تقریبات کرانے کا پروگرام بنایا ہوا ہے اس میں یہ ہے کہ ایک شاعر اور ایک گلوکار کو یہاں بلایا جائے اور اس کی بھرپور پذیرائی کی جائے۔ اپریل میں تو انشاء اللہ آپ اور غلام عباس آ رہے ہیں۔ بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

ارژنگ: مستقبل میں ماہی آرٹس اینڈ کلچر جیسا کوئی اور منصوبہ ہے آپ کے ذہن میں یا کسی اور حوالے سے کام کرنے کا ارادہ ہے؟

ظفر اسلام: مستقبل میں چیرٹی آرگنائزیشن بنانے کا پروگرام ہے۔ ویلفیئر کے حوالے سے کام کرنے کا ارادہ ہے۔ خالصتاً پاکستانی رائٹرز کے لیے اُن کو میڈیکل کے حوالے سے اور تخلیقات کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے حوالے سے ہم ان کی مالی اعانت کریں گے انشاءاللہ اس کا آغاز جلد ہوگا۔

فیصل آباد میں مقیم ممتاز شاعر، سفرنامہ نگار
کالم نویس اور ماہنامہ ''حرفِ جعفر''
کے مدیر ڈاکٹر جعفر حسن مبارک کی
کتب
① میں نے نشہ چھوڑ دیا ہے
② علم المشیات
③ سحر قریب ہے
④ نئے دنوں کے خواب (شاعری)
⑤ دریا سے صحرا تک (سفرنامہ دبئی)
⑥ تنہا رہنا سیکھ لیا ہے (شاعری)
⑦ اپنے استنبول میں (سفرنامہ ترکی)
ناشر
مثال پبلشرز
رحیم سنٹر پریس مارکیٹ، امین پور بازار فیصل آباد

پنجابی کے نامور شاعر
خاقان حیدر غازی کی کتب
① بند گلی وچ شام (شاعری)
② دم دم دم نال دھمال (شاعری)
③ مادھو نال صلاح (شاعری)
④ سے داگیان (شاعری)
⑤ میں چیتر نہیں چکھیا (شاعری)
⑥ ساون لے اُڈ یک (لوک کہانیاں)
⑦ کہے شاہ حسین (منظوم سٹیج ڈرامہ)
ناشر
سانجھ پبلی کیشنز
مزنگ والا چوک، لاہور

برطانیہ میں مقیم معروف نوجوان شاعر
عاصم ندیم کا پہلا شعری مجموعہ
نیا چاند
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الفیر وز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

بچوں کے معروف ادیب، حمد، نعت اور
جدید غزل کے ممتاز شاعر
زاہد محمود شمس کا نعتیہ مجموعہ
پیارے محمد ﷺ
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے
صفحات 144 قیمت 200 روپے
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الفیر وز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

غلام حسین ساجد/ لاہور

بہت آسودہ ہوتی جا رہی ہیں میری آنکھیں
مگر کچھ روز سے اُس کی کمی بڑھنے لگی ہے

نظر سے دہکا ہوا، نور سے اُجالا ہوا
یہ آئنہ ہے کسی دل رُبا کا پالا ہوا
چھلک نہ جائے مرا صبر میری آنکھوں سے
کہ میں نے اُس کو نہیں خود کو ہے سنبھالا ہوا
یہ کون عالمِ وحشت میں ہے ستیزہ کار
یہ کس نے خاک کو ہے خاک پر اُچھالا ہوا
پھر ایک بار مجھے آسماں دکھائی دیا
کسی بھی چاک سے اُترا ہوا نہ ڈھالا ہوا
کبھی جو ہو بھی گیا اذن پھر حضوری کا
میں کیا کروں گا تری بزم سے نکالا ہوا
مجھے خود اپنی تگ و دو پہ ناز ہے ساجدؔ
کہ نامِ عشق مری کوششوں سے بالا ہوا

بے صبر آنکھوں میں کوئی خواب تک بویا نہ تھا
صبح ہونے کو تھی اور میں اب تلک سویا نہ تھا
آ نہیں پائی تھی کوئی شے مری پہچان میں
یعنی میں اپنی ہی دُنیا کا کہیں گویا نہ تھا
ڈھل گیا ہے دامنِ دل بھی مری آنکھوں کے ساتھ
اس سے پہلے مَیں کبھی یوں ٹوٹ کر رویا نہ تھا
میری آزادی الگ تھی میری پابندی الگ
خواب کا جویا تھا لیکن نیند کا جویا نہ تھا
میرے لوگوں سے مری نسبت برائے نام تھی
جب تلک میں نے لباسِ فقر کو دھویا نہ تھا
اب تو اپنی بھی خبر ملتی نہیں ساجدؔ مجھے
اس سے پہلے میں کسی کی یاد میں کھویا نہ تھا

اندھیرا اوڑھتے ہی بے کلی بڑھنے لگی ہے
سحر ہونے لگی ہے روشنی بڑھنے لگی ہے
چمن میں آ گیا ہے کیا بہار ایجاد کوئی
جسے چھو کر گلوں کی تازگی بڑھنے لگی ہے
مری طاقت سے پیدا ہو رہی ہے ناتوانی
اُسے ملتے ہی میری بے بسی بڑھنے لگی ہے
ہوا ہے ختم جس دن سے تعلق اُس سے میرا
ہماری دوستی کچھ اور بھی بڑھنے لگی ہے
سمجھ میں آ رہا ہے کاروبارِ دہر، لیکن
بدن اور روح میں بے گانگی بڑھنے لگی ہے
بہت آسودہ ہوتی جا رہی ہیں میری آنکھیں
مگر کچھ روز سے اُس کی کمی بڑھنے لگی ہے
الگ ہونے لگے ہیں مجھ سے میرے خواب ساجدؔ
ردائے خاک کی جادوگری بڑھنے لگی ہے

قدم اُس مہرباں کا جب تلک منزل میں رہتا ہے
مسافر مخمصے میں راستہ مشکل میں رہتا ہے
وجودِ آئنہ میں جھلملاتی ہے ہنسی اُس کی
اثر اُس کے لبوں کا موجِ آب و گل میں رہتا ہے
بہت تنہا ہوں اوروں کی طرح میں بھی کہ مدت سے
نگاہوں میں بسا ہے اور نہ کوئی دل میں رہتا ہے
بہت بیزار کرتی ہے جہاں کی تیز رفتاری
مزہ آغاز کرنے میں نہ کچھ حاصل میں رہتا ہے
سما پاتے نہیں آنکھوں میں منظر باغِ ہستی کے
کہ دھیان اپنا کسی گل کے رُخِ بے تل میں رہتا ہے
بہت آسودگی دیکھی ہے میں نے بھی مگر ساجدؔ
کوئی غم ہے جو مدت سے کہیں داخل میں رہتا ہے

جہاں میں ڈھالتے رہتے ہیں ماسوا کی طرح
درخت چل نہیں سکتے مگر ہوا کی طرح
بھٹک کے آئی تھی کچھ دیر کو اِدھر دُنیا
لپٹ گئی مرے دل سے کسی بلا کی طرح
مرے حصار سے باہر بھی وہ نہیں رہتا
مرے قریب بھی آتا نہیں خدا کی طرح
بہت سے رنگ اُترتے ہیں میری آنکھوں میں
کسی کے دھیان میں اُلجھی ہوئی صدا کی طرح
اُتر گیا مرے دل میں وہ بے دھڑک لیکن
لبوں پہ آ نہیں پایا ہے مدعا کی طرح
رواں دواں ہیں مرے آس پاس کی اشیا
پڑا ہوا ہوں زمیں پر میں نقشِ پا کی طرح
سمٹ سکوں گا نہ اپنے وجود میں ساجدؔ
پہن لیا ہے کسی نے مجھے قبا کی طرح

متفرق شاعری

دل میں رہا کرو کہ نظر میں رہا کرو
یہ گھر تمہارا ہے اسی گھر میں رہا کرو
محفوظ اس سے بڑھ کے نہیں کوئی بھی جگہ
تم میرے فن میں، میرے ہنر میں رہا کرو
دل کا سرور بن کے بھی رہ سکتے ہو یہاں
یہ کیا کہ تیر بن کے جگر میں رہا کرو
باہر کھلی فضا میں بلا کی ہے زندگی
چوبیس گھنٹے کیا یونہی گھر میں رہا کرو
زندہ ہو تو دیا کرو ہونے کی کچھ خبر
تم خاک پر کہ چاند نگر میں رہا کرو
تشہیر کا ہے شوق تو دو بے تکے بیاں
اور شہر کی ہر ایک خبر میں رہا کرو
ہو دیکھنا اگر کہ کہاں پر کھڑے ہو آج
اغیار کی اور اپنی نظر میں رہا کرو
دل سے اگر محبت چمن ہو تو ہر گھڑی
ہر برگ میں، ہر ایک شجر میں رہا کرو
روحی بنا لو اپنا کوئی مقصد حیات
اور رات دن نگاہ بشر میں رہا کرو

روحی کنجاہی/لاہور

معلوم کیا وہ کس لیے بیمار ہو گئے
مرنے سے پہلے مرنے کو تیار ہو گئے
منزل ہمارے پاؤں جوں ہی چومنے لگی
ہم آپ اپنی راہ کی دیوار ہو گئے

پل بھر کو زندگی سے ملاقات کیا ہوئی
پیدا بدن میں موت کے آثار ہو گئے
موت کا حیات کا، کبھی ٹوٹا نہ سلسلہ
چاہا تو سو گئے کبھی بیدار ہو گئے
دیکھا جدھر جدھر سے گزرتے ہوئے انھیں
رستے ہر ایک گام پہ ہموار ہو گئے
مر کر بھی ہم راہ بری اختیار کی
تاریکیوں میں نور کا مینار ہو گئے
تڑپا کیے ہیں جن کے لیے ایک ایک پل
اُن سے ملے تو ملتے ہی بیزار ہو گئے
رزمی سحر ہوئی تو ہمیں نیند آ گئی
شام آ گئی تو خواب سے بیدار ہو گئے

بشیر رزمی/لاہور

اس شہر بے وفا میں کوئی آشنا ملے
واماندۂ وفا ہوں کوئی در کھلا ملے
حال دل سیاہ کو شاید چھپا سکوں
اے مفتیان شہر مجھے بھی قبا ملے
مصروف آرزوئے مسلسل ہے آدمی
اے کاش سانس لینے کی فرصت ذرا ملے
ٹھہرے ہیں ہم جو اجنبی تیرے دیار میں
تاحد رہگزر تو تیرا آسرا ملے
تو ہے تو کیوں ہو اور کسی در کی جستجو
تجھ سا کوئی کہاں کہ ہمیں دوسرا ملے

اک دل سو داغ داغ ہے اک جاں سو چور چور
دیکھے کوئی وفا کے صلے ہم کو کیا ملے
کس کو سناؤں حال دل مضطرب رحیل
جو لوگ بھی ملے ہمیں اہل جفا ملے

عاشق رحیل/لاہور

آیا ہے کوئی حشر میں مر مر جیتے ہوئے
وارفتگیٔ شوق مسلسل لیے ہوئے
اک پل بھی چین آتا ہے دن کو نہ رات کو
ہم ہیں غم حیات کا ساغر پیے ہوئے
کچھ لوگ تیرہ شب کے اندھیروں میں کھو گئے
روشن فلک پہ گرچہ ہزاروں دیے ہوئے
ان کا علاج چارہ گرو کیا کرو گے تم
یہ زخم تو ہیں اپنے ہی گھر کے دیے ہوئے
پلکوں پہ آنسوؤں کے گل تر سجا کے ہم
بیٹھے ہیں اہتمام بہاراں کیے ہوئے
کوئی ہمیں پیام بہاراں نہ دے رحیل
مدت سے ہم ہیں چاک گریباں سیے ہوئے

عاشق رحیل/لاہور

مہک رہا ہوں کسی کے گل عنایت سے
مجھے نواز گیا ہے کوئی محبت سے
بس اک رواج نے اُس کو بنا دیا میرا
پھر اُس نے جیت لیا مجھ کو اپنی خدمت سے

متفرق شاعری

اُنہی کے حُسنِ عمل کو دوام ہے صاحب
معاملات چلاتے ہیں جو ذہانت سے
مسائل اُس کی طرف اتنا ہی لپکتے ہیں
گریز کرتا ہے جتنا بھی کوئی محنت سے
خدا گواہ نہیں اور کوئی اس کا سبب
ہوئی ہے ساری تباہی ہماری غفلت سے
ہنروری ہی کہوں گا اسے میں حضرت کی
دیے ہیں آپ نے الزام جس سہولت سے
وہ قید ہو کے بھی راشدؔ تھا اتنا زورآور
فرار ہو گیا نگران کی حراست سے
ہمارا مسلک و مشرب ہے صلحِ کل راشدؔ
ہمارا کوئی علاقہ نہیں عداوت سے
ہمارا اپنا ہی اسلوب و رنگ ہے راشدؔ
بندھے ہوئے ہیں روایت سے ہم نہ جدت سے

محمد ممتاز راشد/لاہور

اگرچہ رسمِ تعلق بحال ہو گئی ہے
جو ایک پھانس ہے دل میں، وبال ہو گئی ہے
بچھی ہوئی تھی جو ہر سُو مرے، وفا اُن کی
نجانے کیا ہے کہ اب خال خال ہو گئی ہے
شبیں تھیں جس کی منور، سدا بہار تھے دن
وہ زیست جیسے کہ خواب و خیال ہو گئی ہے
خدا کا شکر گلستاں میں تھی نہ کچھ قدغن
گلوں کو چھو کے طبیعت نہال ہو گئی ہے
کہی ہے کان میں اُس کے اک ایسی ریشمی بات
کہ اُس کے چہرے کی رنگت گلال ہو گئی ہے
اب اُن سے میرے مراسم میں ہے یہ تبدیلی
کہ اُن سے بحث کی مجھ کو مجال ہو گئی ہے
ذرا سا دیکھا تھا اُستادِ محترم نے اسے
سنور کے میری غزل باکمال ہو گئی ہے
مکان ہو گئے اونچے پڑوس کے راشدؔ
ہماری چھت تو کنویں کی مثال ہو گئی ہے

محمد ممتاز راشد/لاہور

وصل کی تھی رات پھر
چھڑ گئے نغمات پھر
لب ترے کہتے رہے
کیسی کیسی بات پھر
دید اُس کی ہو گئی
رقص میں تھی ذات پھر
آنکھ میں سیلاب تھا
اوج پر جذبات پھر
آ گئی دہلیز پر
یاد کی بارات پھر
سارے ابرارؔ اپنے ہیں
بول دو حالات پھر

ڈاکٹر ایم ابرار/لاہور

وہ چھاؤں کیا ہوئی وہ اونچے برگدوں کا کیا ہوا؟
وہ شہریار کیا ہوئے وہ شہرتوں کا کیا ہوا؟
وہ عشق کیا ہوئے؟ غرورِ عاشقی کدھر گئی
وہ شاہجہاں کہاں گیا وہ بستیوں کا کیا ہوا؟
ترے مرے وجود میں جو رنگ و شور و شنگ تھا
وہ شور و شنگ کیا ہوا شرارتوں کا کیا ہوا؟
وہ بھیڑیے جو آ گئے مری زمیں کو کھا گئے
وہ غیرتیں کہاں گئیں وہ بھیڑیوں کا کیا ہوا؟
وہ چاہتیں اُجڑ گئیں وہ خواہشیں جو مر گئیں
وہ دن کہاں چلے گئے وہ حسرتوں کا کیا ہوا؟
وہ جھیل اب کہاں گئی پرند سب کہاں گئے
وہ گاؤں کی زمین اور حویلیوں کا کیا ہوا؟
تجھے کہیں ملے تو یار اُس سے اتنا پوچھنا
اسدؔ وہ خواب کیا ہوئے محبتوں کا کیا ہوا؟

راؤ حیدر اسدؔ/ملتان

ہم کبھی بجھنے نہ دیں گے تیری یادوں کے دیے
اس طرح رکھیں گے قائم تجھ سے اپنے رابطے
پہل کی اک ضد نے سارا کام چوپٹ کر دیا
بڑھتے بڑھتے بڑھ گئے یوں اور بھی کچھ فاصلے
ٹوٹ کر تارے گرے کل رات جب دہلیز پر
وہ بھی آنکھوں سے گیا اور ہم بھی اندھے ہو گئے
سرخیاں اخبار کی کرتی رہیں سڑکوں پہ شور
لوگ اپنے بند کمروں میں پڑے سوتے رہے

متفرق شاعری

اُس کی قسمت میں گلوں کی سیج ہو، آرام ہو
نقش جس نے کر دیے آنکھوں میں میری رتجگے
حسرتیں، تنہائیاں، بے چینیاں، بدنامیاں
زندگی سے بس ہمیں یہ چار ہی تحفے ملے
اس سے پہلے کہ امانت مانگ لے واپس کوئی
اپنے جیون کی کی بیٹی کو شاہد دیکھ لے

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

اُٹھا رہا ہے وہ دیوار کیا کیا جائے
وہ اُس طرف ہے اب اس پار کیا کیا جائے
پرانی بات ہے جب چل گیا تھا وار اپنا
کوئی بتائے کہ اس بار کیا کیا جائے
کبھی وہ گھر سے نکلتا بھی ہے تو پردے میں
اب ایسے شخص کا دیدار کیا کیا جائے
ہنر اگرچہ سب آتے تو ہیں مجھے لیکن
ہے پورا وہ بھی تو فنکار کیا کیا جائے
اندھیری رات ہے تنہائی ہے اور اُس پر دُھند
نہیں ہیں وصل کے آثار کیا کیا جائے
مجھے کسی سے بھی کوئی گلا نہیں صاحب
نصیب ہی میں نہیں پیار کیا کیا جائے
بجا ہے اُس کا تقاضا کہ فاصلہ رکھوں
رہا نہ جائے تو پھر یار کیا کیا جائے

سہیل یار/لاہور

سڑکوں پہ نکل آئے ہیں ترسے ہوئے انساں
پھر دیکھ نہ کچھ پائیں گے، روندے ہوئے انساں
اس سوچ کو ہم سوچتے رہتے ہیں مسلسل
کیا سوچتے ہوں گے بھلا مرتے ہوئے انساں
اس قریۂ سفاک میں، ہم بھی تو ہیں زندہ
ہم بھی ہیں، اس کھیل میں ہارے ہوئے انساں
جب آگ کی بارش ہوئی، میدانِ غزہ پر
دیکھے نہ گئے ہم سے بلکتے ہوئے انساں
ہم تیرے مقابل، کبھی آ ہی نہیں سکتے
لڑتے ہی نہیں ہیں کبھی ڈرتے ہوئے انساں
جس دیس میں دیکھے نہ تھے، اُترے ہوئے چہرے
اب اُس میں نظر آتے ہیں روتے ہوئے انساں
خالد نے اُٹھائی ہیں، وہ لاشیں تو مسلسل
دیکھے ہی نہیں آپ نے سہمے ہوئے انساں

میجر خالد نصر راجہ

ہمیں وہ معتبر ہے
محبت کا اثر ہے
نہیں کتنا ترے بن
یہ تنہا جو سفر ہے
وہ اک انمول ہیرا
مری جس پر نظر ہے
جو چاہو گے ملے گا
یہ محنت کا ثمر ہے
یہاں کانٹے بھی ہوں گے
یہ کلیوں کا نگر ہے
مجھے آواز دے ساگر
تو میرا ہم سفر ہے

صدام ساگر/گوجرانوالہ

ہر ایک محفل سے چہرہ اپنا ہیں موڑ بیٹھے
کہ آشناؤں کو ہم تو کب سے ہیں چھوڑ بیٹھے
ہمارے وہم و گماں میں ہرگز نہیں تھا پہلے
نجانے کیسے ہم ان سے رشتہ ہیں جوڑ بیٹھے
ہمارے وعدے وعہد و پیماں بھی تھے کسی سے
جو اُن کی خاطر کسی سے کب کے ہیں توڑ بیٹھے
خمار جس کی شراب کا اب تلک ہے ہم کو
نجانے ساغر وہ کس طرح ہم ہیں توڑ بیٹھے
نہ چھوڑنے کا ارادہ جن کو کیا تھا ہم نے
ضعیف ان کو نہ جانے کیوں ہم ہیں چھوڑ بیٹھے

ڈاکٹر محمد شاہ کھگہ

نہیں..... اور دل کو جلانا نہیں
تجھے جانے والے بلانا نہیں
گلے مل کے خود کو سنا لوں گا اب
ترا غم تجھے اب سنانا نہیں
یہ طے ہے کہ اب زخم جتنے ملیں
کبھی کوئی طوفاں اُٹھانا نہیں

ستارے بہت ہیں مرے ساتھ اب
کوئی چاند نزدیک لاتا نہیں
سر رہ ملا تو تھا بے تاب وہ
ہے سچ یہ بھی اس نے تو آنا نہیں
سمندر ہے اشکوں کا دل میں بھرا
کوئی اشک لیکن بہاتا نہیں
مری دھڑکنوں کی طرح ہے یہ راجؔ
نظر کا کوئی بھی ٹھکانہ نہیں

رئیس راج/ملتان

دُعائیں بین کرتی ہیں

مرے مالک، مرے مولا!
یہ کیا منظر ہے جو آنکھوں نے دیکھا ہے
مگر دیکھا نہیں جاتا
یہ اک لمحہ قیامت کا
کئی صدیوں پہ بھاری ہے
فضا میں ہر طرف جیسے سکوتِ مرگ طاری ہے
عجب اک ہو کا عالم ہے
رگوں میں خوں نہیں شاید مسلسل درد جاری ہے
مگر یہ بے بسی اپنی!
بہت رونے کی خواہش ہے مگر رویا نہیں جاتا
کسی نے دل کے آنگن میں
مسل کر میرے خوابوں کو
مرے دل کے نہاں خانوں میں ایسا خوف بویا ہے
تھکن سے چور آنکھیں ہیں
مگر سویا نہیں جاتا
خزاں کے سرد موسم میں
بہت تاریک راتوں میں
مرے اُجڑے چمن میں
چارسو پھولوں کا ماتم ہے
مرے چاروں طرف جیسے
کلیجہ چیرتی ٹھنڈی ہوائیں بین کرتی ہیں
لیے بانہوں میں اپنی پھول سی نوخیز کلیوں کو
کفن دے کر پیشانی چومتی بے حال مائیں
بین کرتی ہیں
فلک خاموش ہے لیکن دعائیں بین کرتی ہیں

ابرار ندیم/لاہور

یہاں ہاتھ سے جو چھوٹا وہ ملا نہیں دوبارا
کوئی دائمی محبت نہ ہے دائمی سہارا
غمِ زندگی نے لا کے ہمیں اس جگہ پہ مارا
جہاں اس طرف کنارا نہ ہے اُس طرف کنارا
یہ عجیب سا جہاں ہے یہاں سب ڈسے ہوئے ہیں
کوئی دشمنی کا مارا کوئی دوستی کا مارا
کئی کام رہ گئے ہیں ترے عشق کے سبب سے
ترے ساتھ بھی خسارا ترے بعد بھی خسارا
کوئی دوسرا نہیں ہے مری زندگی میں شامل
ترے عشق نے بگاڑا ترے عشق نے سنوارا
ترے شانے میں ہم نے کبھی جب پلٹ کے دیکھا
کسی اور نے صدا دی کسی اور نے پکارا
ترے ساتھ بیتے لمحے مری زندگی کا حاصل
ترے بعد پھر کسی نے نہیں پیار سے پکارا

ابرار ندیم/لاہور

(حسن عباسی کے لیے محبت کے پھول)

محبت کا علم لے کر حسنؔ محو سفر دیکھا
کہ جیتا جاگتا ہم نے سخن محو سفر دیکھا
نہیں آتا ہنر اس کو کسی کا دل دُکھانے کا
ہنر آتا ہے ظالم کو دلوں میں گھر بنانے کا
بڑے آساں لفظوں میں بڑی باتیں یہ کرتا ہے
جو ذہنوں کو کریں تسخیر ایسے شعر لکھتا ہے
وفا تقسیم کرتا ہے ریاکاری نہیں کرتا
کسی صورت کسی کی بھی دل آزاری نہیں کرتا
ادب کی محفلیں اس کے بنا ویران لگتی ہیں
نگاہ و دل کی بے تابی کا بس سامان لگتی ہیں
کرے یہ اعتراف حُسن اپنا ہو بیگانہ
ہمیشہ دل میں رکھتا ہے یہ چاہت کا ہی پیمانہ
جو باطن ہے وہی ظاہر نہیں رکھتا یہ دو چہرے
اسی کا ہو کے رہتا ہے ملے اک بار جو اس سے
فقط میں ہی نہیں کہتا یہ ساری دنیا کہتی ہے
چمک دائم رہے جس کی حسنؔ وہ سچا موتی ہے
سلیم عمران کے لب پہ دعا کے پھول مہکے ہیں
رہیں متواں اُجالے کا حسن کے جو ستارے ہیں

عمران سلیم/لاہور

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: آدھا خواب/افسانہ نگار: شبہ طراز/صفحات 144 / قیمت: 200 روپے/رائے: احمد عقیل روبی

ناشر: دستاویز، بلاک نمبر 7 آفس نمبر 6 میاں چیمبر 3، ٹمپل روڈ، لاہور

شبہ طراز کی کہانیوں کا یہ مجموعہ ایک منفرد اور عام روش سے ہٹ کر لکھی ہوئی کہانیوں کا مجموعہ ہے جس کے موضوعات بھی نئے ہیں۔ زبان کا لب و لہجہ بھی مختلف ہے۔ شبہ طراز ایک عرصے سے لکھ رہی ہے اور اب اُسے کہانی کے انتخاب اور کہانی کہنے کے ہنر پر پوری گرفت حاصل ہو گئی ہے۔ ''بطن سے باہر کی کہانی'، ''پوری زندگی آدھا خواب''، ''محبت کی نبض''، ''پیپل کا خواب''، ''ترقی کی شاہراہ''، ''خودرو''، ''ماندگی کا وقفہ'' اور ''آگ'' یہ سب ایسی کہانیاں ہیں جن کو پڑھ کے آپ یہ محسوس کریں گے کہ آپ کی ایک ایسے لکھاری سے ملاقات ہو رہی ہے جس کے تجربے اور مشاہدے کی تھیلی میں ایسے روشن اور دُھندلے موضوعات ہیں جن کی گرفت سے آپ اپنے آپ کو آزاد نہیں کر سکتے اور ان کہانیوں کے پڑھے بغیر آپ کو چھٹکارا حاصل نہیں ہوگا۔ میں نے تو ان سب کہانیوں کو پڑھ کے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے لیکن ایک شدید تاثر اب تک ذہن میں محفوظ ہے آپ بھی جب یہ کہانیاں پڑھیں گے تو جو میں نے کہا ہے اس کی تائید کریں گے۔ شبہ طراز جدید کہانی کاروں کی صف میں بڑے اعتماد سے کھڑی ہے اور اس کے پاؤں اپنے حصے کی زمین کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔ اُس کا تجربہ، اُس کا مشاہدہ، اس کا اسلوب اپنا ہے اور بے شک اُس کا شمار اچھے کہانی کہنے والوں میں ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اُس کی کہانیاں اُس کا اسلوب اور کہانیوں کے موضوعات اسی چیز کا تقاضا کرتے ہیں۔

نام کتاب: پروائیاں/شاعر: بے کل اُتساہی/صفحات 160 / قیمت: 300 روپے/فلیپ: شاعر علی شاعر

ناشر: رنگ ادب پبلی کیشنز، 5 کتاب مارکیٹ اُردو بازار، کراچی

رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی نے ان ہندوستانی شعرائے کرام کے مجموعہ ہائے کلام کو شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے جن کا کلام پاکستان میں دستیاب نہیں ہے۔ جناب بے کل اُتساہی کا مجموعہ غزل ''پروائیاں'' اس سلسلے کی پانچویں کڑی ہے۔ اس سے پہلے اسرار الحق مجاز کا ''آہنگ'' خمار بارہ بنکوی کا ''رقص مے'' منور رانا کا ''غزل گاؤں'' اور سہیل غازی پوری کا مرتب کردہ ''۱۰۰ ہندوستانی شاعر (غزلیہ انتخاب)'' شائع ہو چکے ہیں۔ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا تاکہ قارئین شعر و سخن، ناقدین فن و ہنر اور تحقیق کرنے والوں کے لیے نہ صرف مواد فراہم ہو سکے بلکہ فروغ شعر و ادب میں معاونت بھی ہوتی رہے اور دونوں ہمسایہ ممالک کے شاعر و ادیب اس سبب ایک دوسرے کے قریب آتے رہے۔ کیوں کہ ادب کی کوئی سرحد نہیں ہوتی، اس لیے فاصلہ مٹانا بھی ضروری ہے۔

نام کتاب: پانیوں سے الگ/ شاعر: شمشیر حیدر/ صفحات 128 / قیمت: 250 روپے/ فلیپ: خورشید رضوی

ناشر: زمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

جو شخص پرندے کی تصویر بناتے بناتے خود بھی پر نکال لے مگر اس کے بطون میں کچھ نقش پھر بھی ایسے رہ جائیں جنھیں کسی صورت کاغذ پر اُتارنا ممکن نہ ہو اس کے فنکار ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ شمشیر حیدر کا فن ایسی ہی رسائی اور نارسائی کی سرحد پر واقع ہے۔ اس کے ہاں پانیوں سے آئینے تک کا سفر روایت سے انفرادیت کی جانب رواں ہونے کی علامت ہے۔ شمشیر حیدر کو معلوم ہے کہ شعر صرف حُسن معنی سے نہیں حُسن آہنگ سے بھی عبارت ہے۔ اس کی غزل میں عصری شعور جا بجا کلاسیکی پیرہن میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس کا فنی رویہ اس چراغ کا رویہ ہے جس کی لو تند باد زمانہ سے بے نیاز اپنی ہی ضو میں مست ہے۔

نام کتاب: اُردو دوہے/ مصنف: ظہیر غازی پوری انڈیا/ صفحات 144 / قیمت: 300 روپے/ فلیپ: شاعر علی شاعر

ناشر: رنگ ادب پبلی کیشنز، 5- کتاب مارکیٹ اُردو بازار، کراچی

ویسے تو اکثر شاعروں نے اُردو دوہے کم و بیش کہے ہیں۔ مگر جن سخن وروں نے دوہے کو خصوصیت سے اپنایا ہے وہ چند ہیں۔ ان میں سے بھی ایسے دوہا نگاروں کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جاسکتی ہے جن کے دوہوں کے مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ پاکستان کے حوالے سے دوہا نگاروں میں جمیل الدین عالی، طاہر سعید ہارون، جمیل عظیم آبادی، عرش صدیقی، خواجہ دل محمد، الیاس عشقی، رفیع الدین راز، تاج قائم خانی اور ہندوستان کے حوالے سے ڈاکٹر فراز حامدی، ابراہیم اشک، ڈاکٹر نادم بلخی، ناوک حمزہ پوری، بھگوان داس اعجاز، نذیر فتح پوری، اسلم حنیف، امین خیال، بے کل اُتساہی اور تاج سعید، معروف دوہا نگار شامل ہیں۔ ظہیر غازی پوری نے اپنی کتاب ''اُردو دوہے...... ایک تنقیدی جائزہ'' میں دوہا نگاری پر ان مضامین اور ناقدین کی آراء کو شامل کیا ہے جن پر تنقید کی گئی ہے، وزن، بحر، ماترائیں اور چھند کے سلسلے میں بحث ہوئی ہے۔ محترم جمیل الدین عالی اور رشید قیصرانی کی دوہا نگاری پر اس کتاب میں شامل دو بیانات پیش خدمت ہیں، باقی کتاب میں ملاحظہ فرمائیے گا۔ وہ تمام اردو دوہے جن کا فارم جمیل الدین عالی، پرتو روہیلہ وغیرہ کے کلام میں ملتا ہے، ماترائی مقدار اور لے کے اختلاف کے باعث دوہے کے میزان سے خارج ہیں۔ انھیں فردیات کہنا چاہیے۔ رشید قیصرانی نے اپنے دوہے کے لیے وہی بحر استعمال کی ہے جو جمیل الدین عالی کے یہاں مروّج ہے لیکن انھوں نے اس میں ایک رُکن اضافہ کر کے اس بحر پر اپنی مہر ثبت کر دی ہے۔ مگر یہ روش بے راہ روی پھیلانے والی ہے اور فن کو داغ دار کرتی ہے۔

نام کتاب: نیا سورج نکلتا ہے/ شاعر: منظور ثاقب/ صفحات 208 / قیمت: 200 روپے/ فلیپ: امجد اسلام امجد

ناشر: الحمد پبلی کیشنز رانا چیمبر، سیکنڈ فلور، لیک روڈ، لاہور

کسی شاعر کو جستہ جستہ پڑھنے اور کتابی شکل میں اس کا دیوان یا شعری مجموعہ پڑھنے میں بعض اوقات اگر زمین آسمان کا نہیں تو غیر معمولی فرق پڑ جاتا ہے

اور یہ تبدیلی دو طرفہ ہو سکتی ہے۔ منظور ثاقب ان شعراء میں سے ہیں جن کا کلام تسلسل سے پڑھنے سے ان کے بارے میں آپ کی رائے بہتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ (کم از کم میرے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے)۔ ان کے دوسرے مجموعہ کلام ''نیا سورج نکلتا ہے'' کا مسودہ گزشتہ چند دنوں سے میرے زیر مطالعہ ہے اور میں نے محسوس کیا ہے کہ شاعری کے لیے مطلوبہ فنی محاسن کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں Perfection کی تلاش اور ایک فکری رویے کی موجودگی قدم قدم پر دکھائی دیتی ہے۔ بالخصوص ان کی نظموں میں یہ کیفیت زیادہ نمایاں ہے۔ غزل میں وہ عام طور پر رواں بحروں اور مانوس زمینوں کو انتخاب اور استعمال کرتے ہیں مگر مضمون آفرینی کے ضمن میں اپنی راہ خود نکالتے ہیں۔

نام کتاب: قتل گل/ شاعر: سلیمان جاذب/ صفحات 144 / قیمت: 200 روپے/ فلیپ: اسلام عظمی

ناشر: عظمی پبلی کیشنز، عزیز پارک اچھرہ، لاہور

قتل گل ان غموں کا اظہار ہے۔ یہ اُس مشکل گھڑی کی جس وقت ملک عزیز پاکستان میں یہ سانحہ پشاور رونما ہوا تو بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے جذبات کیا تھے اور انھوں نے اس سانحے کے پیش آنے کے بعد اپنے جذبات کا اظہار کیسے کیا۔ یہ اُس کی دستاویز ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب اور اس میں شامل تحریریں اس عظیم سانحے کو دکھ درد کو ختم نہیں کر سکتیں لیکن اس بات کی شاہد ضرور رہیں کہ ملک عزیز پاکستان میں جب جب کوئی مشکل گھڑی آئی تو بیرون ملک مقیم سفیران وطن نے اس مشکل گھڑی میں پاک وطن کے لیے تن من دھن کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ ان کے دل اہل وطن کی محبت میں ہمیشہ دھڑکتے ہیں۔ جس وقت میں سطور لکھ رہا ہوں عین اس وقت میرے سامنے لگے ٹی وی کی سکرین پر خبریں آ رہی ہیں کہ حکومت کی طرف سے اس سانحے کے بعد ملک سے دہشت گردی کے خاتمے کے لیے مؤثر لائحہ عمل کی کوششیں کر رہی ہے۔ مجھے یقین ہے اس بار محض وقتی اجلاسوں، لفظی مباحثوں، الزام تراشیوں اور ڈنگ ٹپاؤ پالیسیوں سے بالاتر ہو کر پوری سنجیدگی اور فکر مندی کے ساتھ سب سر جوڑ کر بیٹھیں گے اور اُن وجوہات کو دور کریں گے جو اس کی وجہ بنتی ہیں۔ سانحہ پشاور کے بعد سفیران وطن کی کیفیت کو الفاظ کی زینت بنا کر اس دعا کے ساتھ تاریخ کے حوالے کر رہا ہوں کہ اچھا مستقبل ہمارا نصیب ہوگا۔

اللہ رب العزت پاک وطن کو شش جہات سے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

نام کتاب: اُردو کے افسانوی ادب پر فسادات 1947 کے اثرات/ مصنف: ڈاکٹر شعیب عتیق خان/ قیمت: 680 روپے/ فلیپ: ڈاکٹر انوار احمد

ناشر: بیکن بکس، غزنی اسٹریٹ اُردو، بازار، لاہور

تقسیم ہند کا مطالبہ کرنے والوں پر عتاب قابل فہم تھا۔ مگر انسانی اقدار کی یوں پامالی ہوگی یہ تو شاید غیظ و غضب میں آئے لوگوں نے بھی قیاس نہ کیا ہوگا کہ یہ زخم ناسور بنا تو جوش انتقام سرحد کے دونوں اطراف بسنے والوں کے منہ کا آخری نوالہ بھی چھین لے گا اور ان کے کم فہم حکمران انسانیت کو نیست و نابود کرنے والے اسلحہ کی تیاری میں جتے رہیں گے۔ بے شک اس سانحے کو گزرے چھ سے زائد عشرے ہو گئے مگر ابھی بھی ضرورت ہے کہ تاریخ، سیاسیات، سماجیات اور نفسیات کے طالب علم اس پیچیدہ واردات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں ہمارے افسانے نے کئی انسانی شہادتیں ریکارڈ کیں۔ ایسے میں کسی نے مقتولین، مغویان، آبرو رہختگان شمار کیے، کسی نے ان کی آل اولاد کو غیرت کے معانی سمجھانے کی کوشش کی۔ کسی نے انسانی فطرت اور سماجیات کے تضاد پر

روشنی ڈالی اور کسی نے اس سب کچھ کو چالاک فرنگی کی کارستانی بتایا۔ مگر انسان دوست اور روشن خیال افسانہ نگاروں نے نفرت کے اس منظرنامے میں سے دل سوزی اور دل داری کے وہ پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی جو جنگ، جہالت اور مفلسی مسلط کرنے والوں کو کبھی عزیز نہیں رہے۔ ڈاکٹر شعیب عتیق خان ہمارے شعبے کے قابل فخر طالب علم ہیں جنھوں نے تعلیم اور تدریس کے بعد حسن انتظام میں نام پیدا کیا ہے۔ گورنمنٹ سائنس کالج ملتان کے پرنسپل کے طور پر انہوں نے اس ادارے کی فضا کو بدل دیا ہے۔ مگر مجھے زیادہ خوشی ہے کہ اب انہوں نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے پر نظر ثانی کر کے اسے مفید حوالوں سے مزین کر کے بیکن بکس کے ذوقِ طباعت کے حوالے کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں میری اس رائے کو خرید کر پڑھنے کو ہی اپنی تکریم کا ذریعہ جانتے ہوں گے۔

نام کتاب: نیند میں چلتے ہوئے/ شاعر: غلام حسین ساجد/ صفحات 232 / قیمت: 400 روپے/ فلیپ: سلیم الرحمٰن

ناشر: سانجھ بک اسٹریٹ، مزنگ روڈ، لاہور

اب میں کیوں کر لکھوں کہ ایک سال قبل ہونے والی آپ سے میری ''وحدہ لاشریک'' ملاقات (ہر چند کہ اس میں اور حضرات بھی 'شریک' تھے) کی یاد اب تک اُسی طرح شگفتہ اور تر و تازہ ہے۔ اُن دنوں میری زندگی جس بے امان دور سے گزر رہی تھی۔ اس میں اتنی پیاری ہستیوں کے ساتھ گزارے ہوئے دلآویز لمحات کو محفوظ کر لینے کی صلاحیت یقیناً محدود ہو جاتی ہے۔ مگر اس زندگی میں بھی اس کے اس بھیانک روپ میں بھی، ایک مختصر انٹرول میں، آپ سے جو ملاقات ہوئی وہ محفوظ رہی۔ عجیب سی بات ہے کہ حنوط نہ ہوئی بلکہ تازہ رہی، جیتی جاگتی! پچھلے ایک برس میں کتنی ہی بار جی چاہا ہے آپ سے مل کر یہ بات کہہ ڈالنے کو مگر کیسے ملتا؟ میں تو دوستوں کی نظر میں ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ س۔ل۔ی۔م۔ا۔ل۔ر۔ح۔م۔ا۔ن..... خیر چھوڑیے اس ذکر کو مجھ بوالہوس کے یہاں حسن طلب کی فراوانی ہے۔ اگر حسن طلب کا پیمانہ ایجاد کر پاتا تو آپ سے ''توہین'' دوبارہ سنتا۔ اس لمحے سوچ رہا ہوں کہ کیسا اچھا ہو کہ جب ''آخر شب'' اُٹھا کر دیکھوں تو اندر سے کاغذ کا ایک پرزہ ملے جس پر ''توہین'' کے وہ سبھی لفظ لکھے ہوں۔ جنہیں میں حافظے پر زور ڈال ڈال کر سنا کرتا ہوں۔

نام کتاب: غرورِ عشق/ شاعر: افتخار بخاری/ صفحات 136 / قیمت: 280 روپے/ فلیپ: رانا عبدالرحمٰن

ناشر: بک ہوم اسٹریٹ 46 مزنگ روڈ، لاہور

ڈاکٹر افتخار بخاری گزشتہ تیس سال سے علمی، ادبی اور سیاسی و سماجی حلقوں، سٹڈی سرکلز اور جد و جہد میں ہمارے ہم رکاب ہیں۔ ان سے میرا تعارف ایک سیاسی اور سماجی دانشور، صحافی اور کالم و مضمون نگار کی حد تک تھا لیکن اتفاق سے جب ان کی شاعری کی کتاب ''گمانِ آگہی'' کی اشاعت کا موقع ملا تو میرے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ ان کے اندر ایک فطری شاعر، ایک فلسفی اور ایک ادیب بھی چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ ''گمانِ آگہی'' جب بار بار چھاپنا پڑی تو میری اس حیرانی میں مزید اضافہ ہوا۔ علمی و ادبی حلقوں نے جس طرح سے ڈاکٹر افتخار بخاری کی پذیرائی کی وہ بھی میری اشاعتی زندگی کا ایک نیا تجربہ تھا۔ اب ایک سال بعد ہی شاعری کی دوسری کتاب ''غرورِ عشق'' اس حیرت میں ایک اور اضافہ ہے اور شاعری میں جو نئے حوالے اور اسلوب مجھے اس کتاب میں نظر آئے ہیں اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب یہ بحث بہت آگے تک جائے گی۔ کچھ کتابیں شائع کر کے ہمیں خود بھی لطف و تسکین کا احساس ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی ہی کتاب ہے۔

ادبی خبریں/تقریبات

ایوانِ صدر میں محفلِ مشاعرہ

یومِ پاکستان کے حوالے سے محفلِ مشاعرہ ایوانِ صدر اسلام آباد میں منعقد ہوئی جس کی صدارت صدر ممنون حسین نے کی۔ اس محفلِ مشاعرہ میں ملک بھر سے نامور شعراء نے شرکت کی جن میں عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، انور شعور، انور مسعود، پیرزادہ قاسم، رسا چغتائی، اعجاز رحمانی، اظہار الحق، فاطمہ حسن، رخشندہ نوید، محسن شکیل، نوید حیدر ہاشمی، حسن عباسی، ابرار ندیم، بشریٰ فرخ، نورین طلعت عروبہ، عمیر انجم اور کاشف حسین کاشف کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ محفلِ مشاعرہ میں سامعین کی بھی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ نظم و غزل کے علاوہ شعراء نے یومِ پاکستان کے حوالے سے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ نظامت کے فرائض ممتاز شاعر اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے ادا کیے۔ خطبہ صدارت میں صدر پاکستان ممنون حسین نے شعراء کا شکریہ ادا کیا اور انھیں وطنِ عزیز میں کرپشن کے خاتمہ کے لیے شعری اور عملی حوالے سے اپنا کردار ادا کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ آخر میں انھوں نے اپنے پسندیدہ اشعار بھی سنائے جنھیں شعراء اور سامعین نے بہت پسند کیا۔

''نقطہ'' کی تقریب پذیرائی

ممتاز شاعرہ، کالم نویس اور ڈائریکٹر پلاک ڈاکٹر صغرا صدف کے کالموں پر مشتمل کتاب ''نقطہ'' کی تقریب پذیرائی آواری ہوٹل لاہور میں ہوئی۔ صدارت ممتاز صحافی آئی اے رحمٰن نے کی۔ مہمانانِ خصوصی میں مجیب الرحمٰن شامی، منو بھائی اور عطاء الحق قاسمی تھے۔ تقریب میں نامور ادیبوں اور صحافیوں نے شرکت کی۔ ڈاکٹر صغرا صدف نے تقریب کے آغاز میں ہی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والے اپنے کالموں کے حوالے سے بات کی۔ عطاء الحق قاسمی، منو بھائی اور مجیب الرحمٰن شامی نے ڈاکٹر صغرا صدف کو منفرد اور کامیاب کالم نگار قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت خواتین کالم نگاروں میں وہ سرِفہرست ہیں۔ مختلف موضوعات پر نہایت سلیقے سے لکھے گئے اُن کے کالم بہت اہم ہیں۔ وہ ایک محبِ وطن اور سیاسی بصیرت رکھنے والی کالم نگار ہیں۔

وہاڑی میں گل رنگ مشاعرہ

جشنِ بہاراں کے حوالے سے وہاڑی میں گل رنگ کے عنوان سے ایک خوبصورت محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی۔ مشاعرے کا اہتمام ضلعی انتظامیہ نے کیا تھا۔ یہ مشاعرہ نامور شاعر مرتضیٰ برلاس کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں پنجاب سے ممتاز شعراء نے شرکت کی جن میں سید مبارک شاہ، رحمٰن حفیظ، عبدالرحمٰن عابد، حسن عباسی، شکیل جاذب، رضی الدین رضی، خورشید بیگ میلسوی، مجید خاور، ذیشان اطہر، اعجاز توکل، اعجاز دانش، راشد تبسم، رحمٰن فارس، صابر انصاری اور مختلف شہروں سے آئے ہوئے شعراء شامل ہیں۔ درجنوں مقامی شعراء نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ نظامت کے فرائض خوبصورت شاعر اور کمپیئر ندیم بھابھہ نے ادا کیے۔ اس موقع پر شعراء کو اعزازی شیلڈز سے بھی نوازا گیا۔

میرب ریسٹورنٹ ہائی سٹریٹ ساہیوال میں محفلِ نعت کا انعقاد

معروف سماجی، ادبی شخصیت اور ساہیوال چیمبر آف کامرس کی ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن محسن کریم نے میرب ریسٹورنٹ ہائی سٹریٹ ساہیوال میں ایک نعتیہ محفل کا انعقاد کیا۔ جس کی صدارت حاجی نوید کریم نے کی۔ مہمانانِ خصوصی سعید کریم، مزمل اقبال، دانیال سعید جبکہ مہمان اعزاز مرزا عامر فاروق تھے۔ منعقدہ محفل میں جن نامور شاعروں اور نعت خوانوں نے بارگاہ رسالت مآبؐ میں نذرانہ عقیدت پیش کیا ان میں علی رضا، محمد حسین منہاس، اسلم سحاب ہاشمی، مزمل حسین ہاشمی، سید احمد نقشبندی، عدنان مصطفیٰ اور قاری غلام حسن بصری کے نام شامل ہیں۔ اس موقع پر

نظامت کی ذمہ داریاں عمران شکیل نے خوش اسلوبی سے ادا کیں۔

محفل مشاعرہ

نستعلیق دوست کے زیر اہتمام محفل مشاعرہ کاسموپولیٹن کلب باغ جناح میں ہوئی۔ یہ تقریب آسٹریلیا سے آئے ہوئے شاعر ظفر خاں کے اعزاز میں منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت معروف شاعر خالد شریف نے کی۔ مہمان خصوصی ظفر خاں تھے۔ جبکہ مہمانانِ اعزاز نیلما ناہید درانی اور ممتاز راشد تھے۔ نظامت کے فرائض ملک سلیم اختر نے ادا کیے۔ تقریب کے آغاز سے قبل میزبان حسن عباسی نے ظفر خاں کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے گفتگو کی اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ محفل مشاعرہ میں جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا اُن میں خالد شریف (صدر) مہمانانِ خصوصی (ظفر خاں) نیلما ناہید درانی (مہمانِ اعزاز)، ممتاز راشد (مہمانِ اعزاز)، خاقان حیدر غازی، حسن عباسی، علی رضا کاظمی، ناز بٹ، فاخرہ انجم، بشریٰ حزیں، حرا رانا، ملک سلیم اختر، احمد سبحانی آکاش، روحی طاہر، افتخار شوکت، ڈاکٹر نادر علی شاہ، سعدیہ گیلانی اور پروفیسر جمیل تقریب کے آخر میں پرتکلف ڈنر کا اہتمام تھا۔

شبیر رحمانی کے لیے ایوارڈ

خواجہ فرید سنگت کے زیر اہتمام ایک محفل مشاعرہ میں اعتراف انٹرنیشنل اور نستعلیق دوست کی طرف سے حسن عباسی نے سرائیکی کے منفرد اور معروف شاعر شبیر رحمانی کو خواجہ غلام فرید ایوارڈ مع دس ہزار کیش پرائز دیا۔ اس موقع پر لاہور کے معروف شعراء کرامت بخاری، ملک سلیم اختر، توقیر شریفی، واجد امیر، ریاض رومانی، محترمہ بجاجی، حسن بانو اور تقریب کے میزبان پروفیسر جمیل بھی موجود تھے۔

حسن عباسی کے ساتھ شام

شاعر اور سفرنامہ نگار حسن عباسی کے ساتھ منہاج القرآن یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں منہاج لٹریری سوسائٹی ایک شام کا اہتمام کیا گیا جس میں ایم اے اُردو اور ایم فل اُردو ادب کے طلباء و طالبات نے بھرپور شرکت کی۔ صدر شعبہ ڈاکٹر مختار عزمی نے پروگرام کی صدارت کی۔ مہمان خصوصی حسن عباسی تھے جبکہ نظامت کے فرائض نازیہ نیاز نے ادا کیے جو کہ ''حسن عباسی کی ادبی جہات'' کے عنوان سے ایم فل کا مقالہ لکھ رہی ہیں۔ تقریب کے آغاز میں صدر شعبہ نے حسن عباسی کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے گفتگو کی اور اُن کے چند اشعار طلبا کو سنائے۔ نازیہ نیاز نے حسن عباسی کا تعارف پیش کیا۔ اس کے بعد انھیں دعوتِ کلام دی گئی جس میں انھوں نے اپنی شاعری سنائی جس پر طلباء و طالبات نے دل کھول کر داد دی اور غزلوں اور نظموں کو بہت پسند کیا۔ اس کے بعد حسن عباسی کو منہاج لٹریری سوسائٹی کی طرف سے عہدیداران نے پھول پیش کیے اور آخر میں طلبا نے حسن عباسی سے اُن کی زندگی اور فن سے متعلق سوال کیے۔ طلباء کے علاوہ اس تقریب میں اساتذہ نے بھی شرکت کی آخر میں صاحب صدارت نے کہا کہ ایسی تقاریب کے انعقاد کا مقصد طلبا کی ادبی تربیت ہے اور یہ سلسلہ انشاء اللہ یونیورسٹی میں وقتاً فوقتاً جاری رہے گا جس میں معروف شعراء کو بلایا جائے گا۔

سلیمان جاذب کے اعزاز میں تقریب

دبئی میں مقیم نوجوان شاعر سلیمان جاذب کے اعزاز میں تقریب خواجہ فرید سنگت کے زیر اہتمام کاسموپولیٹین کلب باغ جناح میں ہوئی تقریب کی صدارت باقی احمد پوری نے کی۔ جبکہ مہمانانِ خصوصی میں کرامت بخاری، خالد شریف اور واجد امیر تھے۔ حسن عباسی نے سلیمان جاذب کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ حسن بانو نے بھی سلیمان جاذب کی دبئی میں ادبی خدمات کو سراہا۔ اس موقع پر محفل مشاعرہ بھی منعقد ہوئی جس میں صاحب صدر اور مہمانان کے علاوہ دیگر شعراء نے بھی کلام پیش کیا۔ آخر میں سلیمان جاذب سے اُن کا بہت سا کلام سنا گیا۔

مولا شاہ کانفرنس

مولا شاہ کانفرنس گزشتہ دنوں پلاک کے ہال میں منعقد ہوئی جس کی صدارت پنجابی کے ممتاز ادیب ڈاکٹر شہباز ملک نے کی۔ مہمانان خصوصی میں عاشق رحیل، ڈاکٹر صغرا صدف اور حسن عباسی شامل تھے۔ کمپیئرنگ کے فرائض پنجابی کے معروف نوجوان شاعر عقیل شافی نے ادا کیے۔ اس کانفرنس میں ملک کے مختلف حصوں سے شعراء اور ادباء نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ مولا شاہ کی شخصیت اور فکر کے حوالے سے مقالے پڑھے گئے

اور منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا گیا۔ مولا شاہ کانفرنس کے روح و رواں میاں ظفر مقبول نے ملک بھر سے آئے ہوئے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور مولا شاہ ویلفیئر سوسائٹی اور تنظیم کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر شعراء اور ادبا کو ان کی ادبی خدمات کتب اور کارکردگی کے حوالے سے لوحِ تحسین، ایوارڈز، شیلڈز اور تحائف دیئے گئے۔ صاحب صدر ڈاکٹر شہباز ملک نے تقریب اور پنجابی زبان و ادب کے حوالے سے خطبہ دیا۔

محفل مشاعرہ

قلم کار بیٹھک کے زیر اہتمام منفرد لب و لہجے کے خوبصورت شاعر حسنین اصغر تبسم کے اعزاز میں ISPR ملتان میں ایک خوبصورت شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ نظامت عمار یاسر تمسی نے کی۔ میجر اسد محمود، سید سہیل عابدی اور منور آکاش نے صاحب شام کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے گفتگو کی۔ جن شعراء نے کلام نہیں کیا اُن کے اسمائے گرامی ہیں حسنین اصغر تبسم، ایوب کموکا، راؤ حیدر اسد، سید سہیل عابدی، سید شارق جمیر، ڈاکٹر وقار خان، سلیم واقف، قیصر عمران تمسی، جاوید اسحاق، طاہر میر آخر میں میجر اسد محمود خان نے حسنین اصغر تبسم کو ISPR اور قلم کار بیٹھک کی طرف سے یادگاری شیلڈ پیش کی۔ رپورٹ طارق جاوید

تقریب پذیرائی

منفرد لہجے کے نوجوان شاعر شاہد ایم بیگ کی کتاب ''میری فکر میرا جنوں'' کی تقریب پذیرائی کاسموپولیٹن کلب باغ جناح لاہور میں ہوئی۔ تقریب کی صدارت صاحب کتاب کے اُستاد گرامی جناب انور مغل ایڈووکیٹ نے کی۔ مہمان خصوصی پنجابی کی معروف ادیبہ بیاجی تھیں۔ نظامت کے فرائض معروف کمپیئر ملک سلیم اختر نے ادا کیے۔ مہمان اعزاز ممتاز شاعر فیصل حنیف تھے اور صاحب کتاب کے حوالے سے حسن عباسی، میجر (ر) نصر خالد، افتخار شوکت، پروفیسر جمیل، ملک سلیم اختر، بیاجی، فیصل حنیف ایڈووکیٹ اے ڈی نسیم ایڈووکیٹ اور صاحب صدر نے گفتگو کی اور شاہد ایم بیگ کو خیال اور فکر کے حوالے سے منفرد شاعر قرار دیا۔ اس موقع پر شاہد ایم بیگ ایڈووکیٹ کے وکلا دوستوں نے بھی بھرپور شرکت کی اور خیالات کا اظہار بھی کیا۔ انھوں نے صاحب کتاب کو مبارک باد پیش کی۔

دیگر شرکاء میں میجر (ر) مظفر علی بھٹی، اے ڈی نسیم ایڈووکیٹ، شاہد ظہیر سید ایڈووکیٹ، احمد خاں گوندل، شفقت قدیر چودھری (ایڈووکیٹ)، مرزا فضل بیگ اور علی فضل میر کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

نام کتاب: تنویر ظہور دیاں پنجابی ادبی خدمتاں

مقالہ نگار: روبینہ کرمانی

تبصرہ: ڈاکٹر ثریا احمد

صفحات: 207

پبلشر: تسکین ذوق 40 سی ماڈل ٹاؤن، لاہور

روبینہ کرمانی لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی کی ایم ایس کی طالبہ ہیں۔ انہوں نے میری زیر نگرانی ''تنویر ظہور دیاں پنجابی ادبی خدمتاں'' بارے تحقیقی مقالہ لکھا۔

انہوں نے اس مقالے میں تنویر ظہور کا علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کے حوالے سے کوئی کونہ نہیں چھوڑا۔ تنویر ظہور اُردو اور پنجابی زبان و ادب پر عبور رکھتے ہیں۔ انہوں نے پنجابی زبان و ادب کی بے بہا خدمت کی ہے۔ ان کی زیادہ تر شاعری پنجابی ہے۔ پنجابی اُردو کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نثر نگاری میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ اُردو کے علاوہ پنجابی صحافت بھی کر رہے ہیں۔ اس کی بڑی مثال ''جنگ'' جیسے بڑے اور سب سے زیادہ تعداد میں چھپنے والے اردو اخبار میں تنویر ظہور پنجابی میں کالم ''چانن'' کے نام سے لکھتے ہیں۔ پچھلے چالیس سال سے اُردو پنجابی رسالہ ''سانجھاں'' شائع کر رہے ہیں۔ روبینہ کرمانی نے بڑی محنت اور محبت کے ساتھ مقالہ لکھا۔ انہوں نے مقالے میں ترکیبیں، استعارے اور تشبیہات کو نئے ڈھنگ سے استعمال کیا ہے۔ انھوں نے تنویر ظہور کی شخصیت، ادبی اور صحافتی کام اور پنجابی خدمت کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ روبینہ کرمانی کا تحقیقی کام سراہنے کے قابل ہے۔ تحقیق کے ساتھ تنقید بھی منفرد انداز میں کی ہے۔ روبینہ کرمانی کی صلاحیتوں کی میں قدر کرتی ہوں۔ مقالے کی کامیاب تکمیل پر انھیں مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

نامہ ہائے احباب

''ارژنگ سخن'' پیارے حسن عباسی (صاحب)
السلام علیکم۔ بہار آفریں سرورق اور ''ارژنگ رنگ'' ادبیات کے ساتھ ماہ نامہ ''ارژنگ'' رونق افروز ہوا۔ اس کے آنے سے یوم پاک (۲۳ مارچ) کی خوشیاں دوبالا ہوئیں۔ آپ حیرت انگیز شاعری کی طرح ادارت میں بھی دست وقلم ہیں۔ چاہے خوش آمدید کہیں چاہے وعلیکم السلام چاہے بٹھائیں چاہے اُٹھائیں۔ خدا آپ کا ''ڈولا'' سلامت رکھے۔ ''سلسلہ یادرفتگاں'' میں خوش کلام عامر بن علی نے احمد عقیل روبی کا انٹرویو رقم کیا ہے۔ احمد عقیل روبی کی شخصی وسعتیں اُجاگر ہوئیں۔ میں روبی مرحوم کا پرانا پڑھنے والا، ان کا بہت دل دادہ ہوں۔ اپریل 2009 میں میرے مجموعہ کلام ''درکنار'' کی تقریب رونمائی الحمرا ادبی بیٹھک لاہور میں ہوئی تھی۔ امجد اسلام امجد نے صدارت کی تھی۔ لاہور کے مشاہیر ادب نے مقالے پڑھے۔ تقریریں کیں۔ احمد عقیل روبی نے ایک حوصلہ افزا مضمون سے میری عزت بڑھائی تھی۔ یہی مضمون بیاض مئی 2009 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

احمد عقیل روبی مضمون نگاری اور شاعری میں ہر اعتبار سے منفرد تھے۔ وہ ہم سے بچھڑ گئے یادیں باقی ہیں۔ کیا خبر ''ہم'' بھی ان سے جا ملیں۔

خیر اندیش/ آصف ثاقب

جناب حسن عباسی بھائی! السلام علیکم

اُمید ہے آپ مع اہل خانہ خیریت سے ہوں گے۔ غزل کے ساتھ دو نظمیں بھی ارسال کر رہا ہوں۔

نصرت صدیقی
فیصل آباد

برادرم عزیز وگرامی حسن عباسی صاحب السلام علیکم!

میں جس پر برسوں پہلے ایک نقاد نے پاکستان کے سب سے زیادہ چھپنے والے شاعر کا الزام لگایا تھا۔ اب شاید سب سے زیادہ چھپنے والا شاعر بن گیا ہوں۔ اس کی وجہ کسر نفسی نہیں، ٹیکنالوجی کی ترقی ہے جس نے مجھ جیسے سست رو کو پچھاڑ کر اپنی تیز روی کا ثبوت دیا ہے۔

کئی دنوں، مہینوں بلکہ برسوں سے چاہ رہا تھا کہ ''ارژنگ'' کے لیے آپ کی فرمائش پوری کروں۔ آپ نے تشریف لانے کی کئی بار دھمکی بھی دی جو شاید ''اپنی اپنی موج میں کچھ وہ نہ تھے کچھ ہم نہ تھے'' کے باعث پوری نہ ہوئی اور میں آپ کی آمد کے انتظار میں یا شاید اپنی کاہلی کے باعث غزلیں نقل کر کے نہ بھجوا سکا۔ اس دوران میں ''ارژنگ'' متواتر ملتا رہا اور میری شرمندگی اور پچھتاوے میں اضافہ کرتا رہا۔ پھر بھی مجھے یہ حوصلہ رہا کہ میں آج یا کل ضرور اس مسئلے کا حل نکال لوں گا اور آپ سے اور مدیر اعلیٰ سے سُرخ رو ہوں گا۔

خیر اب جا کر میں نے کچھ غزلیں منتخب کی ہیں اور ارژنگ کے لیے بھجوا رہا ہوں۔ اگر آپ کو خوش آئیں تو میری شرمندگی میں کمی ہوگی اور مسرت میں اضافہ!

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ میرا آبائی گاؤں بستی کبیر سنپال (میاں چنوں) ہے۔ اب تک سترہ کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں شعری مجموعوں کی تعداد چودہ ہے۔ مرتبہ کتابیں ان کے علاوہ ہیں اور بہت سا غیر مطبوعہ کلام ابھی شائع ہونا باقی ہے۔

آپ کے مطالعے کے لیے اپنے دو شعری مجموعے ''نیند میں چلتے ہوئے'' (اردو نظمیں) اور مونجھ پنجابی نظماں بھجوا رہا ہوں۔ موخر الذکر مجموعے کے آخر میں میری کتابوں کی فہرست موجود ہے جو شاید کسی رائٹ اپ کے لیے آپ کی مددگار ہو۔

ان مجموعوں پر آپ کی رائے ارژنگ میں چھپ جائے تو کیا کہنے! خدا کرے، آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا اپنا
غلام حسین ساجد
لاہور

برادرم حسن عباسی صاحب! تسلیمات!

خدا کرے آپ بخیریت تمام ہوں۔ ماہنامہ

''ارژنگ'' جس تسلسل اور وقار کے ساتھ اشاعت پذیر ہے لائق ستائش ہے۔ برادرم نصرت صدیقی کے توسط سے کبھی کبھی پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ خوشی ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں ''ارژنگ'' کے حوالے سے ایک نظم ہو گئی تھی آج ارسال کر رہا ہوں۔ نیز اپنا دوسرا شعری مجموعہ ''نیا سورج نکلتا ہے'' بھی ارسال خدمت ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو ''ارژنگ'' میں کوئی گوشہ لگا سکتے ہیں۔ آپ کی خیریت کا طالب

منظور ثاقب

فیصل آباد

آپ نے از حد عنایت فرماتے ہوئے اپنی ادارت میں شائع ہونے والا خوبصورت ادبی رسالہ ''ارژنگ'' ارسال فرمایا۔ ہم آپ کی اس عنایت پر ممنون ہیں۔ یہ مجلہ یقیناً آپ کی ادارتی، تحقیقی و تصنیفی صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اُمید ہے کرم فرمائی کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رکھیں گے تاکہ ہم مستفید ہوتے رہیں۔ اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

مخلص/علی یاسر

اسسٹنٹ ڈائریکٹر اکیڈمی ادبیات

اسلام آباد

برقی خطوط

سر! ارژنگ بھیجنے کا بہت شکریہ

رستم نامی/مانسہرہ

جی بہت شکریہ! ارژنگ مل گیا ہے۔ غزل لگانے کا بھی بہت شکریہ

عزت مآب

شیخوپورہ

حسن بھائی! ارژنگ کے شمارے مل گئے ہیں۔ بہت شکریہ

ساحل سلہری

سیالکوٹ

ارژنگ مل گیا ہے۔ حسب معمول آپ کی محبت کا عکس ہے۔ شکر گزار ہوں۔

ارشد نعیم

شیخوپورہ

ارژنگ کا شمارہ مل گیا ہے۔ بہت شکریہ

اشرف سہیل

ماہنامہ پکھیرو

حسن بھائی! السلام علیکم۔ ارژنگ موصول ہوا۔ آپ کا بہت ممنون ہوں۔ اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

شاہین عباس

شیخوپورہ

برطانیہ میں مقیم ممتاز شاعر

کالم نویس اور محقق

احسان شاہد کا چوتھا شعری مجموعہ

تیرا ساتھ رہتا ہے

مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

ناشر

نستعلیق مطبوعات

الفیر وز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

0300-4489310 / 0423-7351963

شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے

کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

ممتاز شاعر اسلم کولسری کا تازہ شعری مجموعہ

''کیف''

غزلیں، نظمیں، گیت اور سیکنڈے نیوین شاعری کے تراجم

فلیپ سید ضمیر جعفری، ڈاکٹر طارق عزیز

ناشر

مکتبہ تعمیر انسانیت

الفیر وز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

ادب کے فروغ اور ترویج میں میڈیا کا کردار نہ ہونے کے برابر ہے

آسٹریلیا میں پاکستانی کلچر اور ادب کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں

مستقبل میں پاکستانی ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا چاہتا ہوں

ماہی آرٹس اینڈ کلچر آسٹریلیا کے بانی اور ممتاز شاعر ظفر اسلام سے حسن عباسی کی گفتگو

ارژنگ: آپ نے تعلیم کہاں تک حاصل کی؟

ظفر اسلام: میں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر شیخوپورہ میں حاصل کی۔ گریجوایشن بھی اسی شہر کے گورنمنٹ کالج سے کیا۔ بعد میں بسلسلہ روزگار سعودی عرب چلا گیا تو تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکا۔

ارژنگ: آپ کو کب احساس ہوا کہ آپ کے اندر تخلیق کار موجود ہے؟

ظفر اسلام: مجھے بچپن سے ہی میوزک سے بہت دلچسپی تھی۔ پھر جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا تو میرا رُجحان فوک میوزک اور صوفیانہ کلام کی طرف بڑھتا گیا لیکن میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں خود بھی کبھی لکھوں گا۔ ایک دن میں ویسے رات کے وقت سڑک پر تنہا گھوم رہا تھا کہ چند لائنیں ذہن میں آ گئیں۔ میں نے ان کو ڈائری میں لکھ لیا پھر ایک روز میرا بھائی جو کہ برطانیہ میں رہتا ہے پاکستان آیا تو میں نے اس کو وہ لائنیں سنائیں تو اُس نے بے ساختہ کہا "یہ تو شاعری ہے" وہ لائنیں اس وقت تو مجھے یاد نہیں البتہ ڈائری میں آج بھی لکھی ہوئی ہیں۔ بھائی کا بے ساختہ جملہ سُن کر مجھے احساس ہوا کہ میرے اندر تخلیق کار موجود ہے۔

ارژنگ: کیا گھر کا ماحول ادبی تھا۔ عموماً بچے سب سے پہلے گھر کے ماحول کا اثر قبول کرتے ہیں۔

ظفر اسلام: والدین اور سب بہن بھائی تعلیم کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اس لیے اسکول کی کتب میں جتنا ادب تھا ابتدا میں اُس کا اثر لیا۔ البتہ گھر میں ادبی کتب کبھی نظر نہیں آئیں۔ گھر کے قریب ایک پرائیویٹ لائبریری تھی جہاں میں جا کر کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ میں نے میٹرک کا امتحان پاس کرنے سے پہلے بچوں کا ادب اور پھر بڑے ادیبوں میں نسیم حجازی، عنایت اللہ، رضیہ بٹ، ابن صفی کی کتب پڑھ لی تھیں۔

ارژنگ: باقاعدہ شاعری کا آغاز کب ہوا؟

ظفر اسلام: جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ گریجویشن کے بعد میں سعودی عرب چلا گیا اور الیکٹرونکس کے بزنس سے وابستہ ہو گیا وہاں فیملی کے بہت سے لوگوں کی موجودگی کے باوجود عجیب وغریب سی تنہائی مجھے گھیرے رکھتی تھی۔ لہٰذا میں نے اس تنہائی کا اظہار شاعری لکھ کر شروع کر دیا لیکن میرے اندر یہ بات پہلے سے موجود تھی کہ اس کا کوئی نہ کوئی وزن ہوتا ہے۔ ابتدا میں تو میں اوپر اور نیچے والے مصرعے کے لفظ گن لیا کرتا تھا بعد میں پاکستان آیا تو عروض کے حوالے سے تلاش جاری رہی کہ اس کا پتہ چلنا چاہیے۔ اسی سلسلے میں روحی کنجاہی سے ملاقات ہوئی۔ احمد ندیم قاسمی صاحب سے بھی ملا۔ بہت مفید مشورے ملے۔ مگر کسک باقی رہی۔ سو اپنے ہی شہر میں جناب صدیق تاثیر سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ (جاری ہے)

اوشی بانا

جس طرح "بونسائی" جاپانیوں کے فطرت سے لگاؤ کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ آرٹ کا حصہ بھی ہے، جس میں پودے کی اس طرح تراش خراش کی جاتی ہے کہ سالہا سال بلکہ بعض اوقات صدیوں کی عمر پالنے کے باوجود پودے کا قد چند انچ سے زیادہ اونچا نہیں ہونے پاتا۔ اسی طرح "آ کے بانا" پھولوں کی آرائش و ترتیب کا فن ہے جس کی باقاعدہ تعلیمی اداروں میں تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ یہاں سے ملتا جلتا فن "اوشی بانا" کا بھی ہے۔ بنیادی طور پر یہ بھی پھول پتیاں سجانے اور ان سے فن پارے تخلیق کرنے کا ہنر ہے۔ مگر آرٹ کے اس شعبے کی خصوصیت اور انفرادیت یہ ہے کہ تازہ پھولوں اور پتیوں کو فنکارانہ حسن ترتیب بخشنے کے بعد آرائشی فریموں میں اپنے مخصوص انداز سے پیک کیا جاتا ہے کہ برس ہا برس بیت جانے کے باوجود پھول سوکھتے اور مرجھاتے نہیں ہیں۔ ان کی فطری تروتازگی اور رنگ و روپ برقرار و دائم رہتے ہیں۔ پھولوں کو تر و تازہ رکھنے میں کلیدی کردار فریم ادا کرتے ہیں۔ فن پاروں کی صورت میں ڈھلنے کے بعد گل و سمن کو ایسے میٹریل سے بنے فریم میں بند کیا جاتا ہے جو کہ ہر طرح کے موسمی اور دیگر بیرونی اثرات سے ان کو محفوظ بنا دیتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں فریم کے اندر موجود تمام ہوا کو خارج کر دیا جاتا ہے۔ گویا ایک مصنوعی خلا ان پھول و پتیوں کے ارد گرد قائم کر دیا جاتا ہے۔ اس فن کو یہاں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں "اوشی بانا" کی تربیت دینے کے لیے کلاسز ہوتی ہیں۔ معیاری شہ پاروں کو آرٹ گیلریز میں نمائش کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ نیپال سے تعلق رکھنے والی خاتون چینا سلوال میرے دوست درو دیو ساردی کی اہلیہ اور "اوشی بانا" کے فن میں ماہر مانی جاتی ہیں۔ گزشتہ دنوں ان کے تخلیق کردہ فن پاروں کو سرکاری آرٹ گیلری میں نمائش کے لیے پیش کیا گیا۔ ان کی دعوت پر میں یہ نمائش دیکھنے کے لیے گیا اور ان سے میں نے ارژنگ کے قارئین کے لیے ان فن پاروں کی تصاویر کی فرمائش کر دی۔ فرمائش پوری کر دی گئی۔ چند تصاویر قارئین کے لیے پیش خدمت ہیں۔

عامر بن علی - جاپان

Design By: 0300-4526021
MUHAMMAD AHSUN Gull

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com